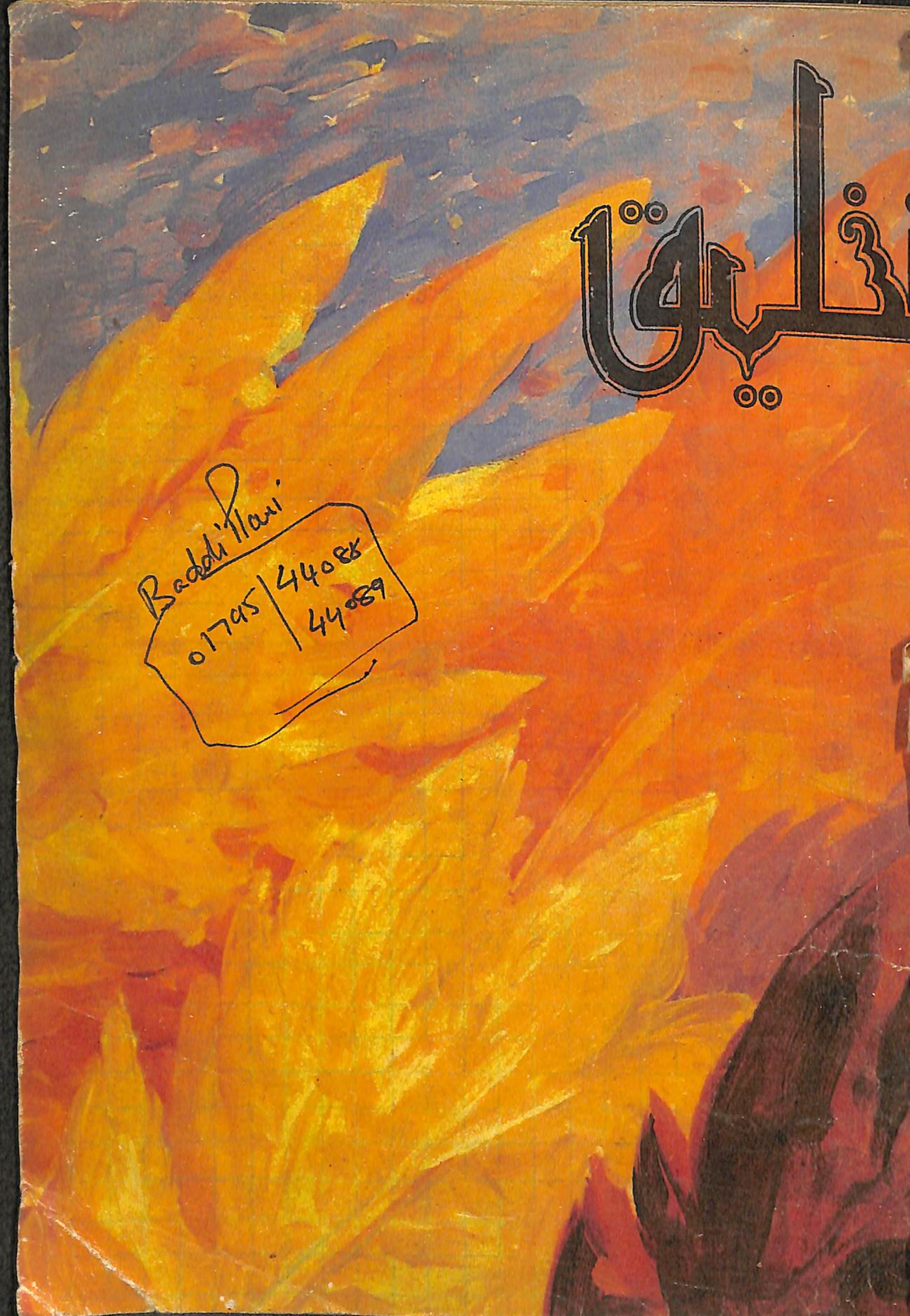
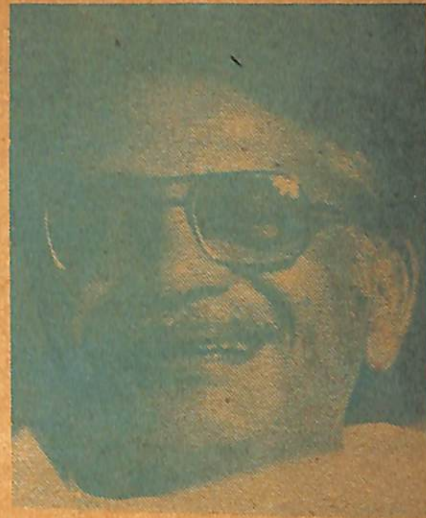
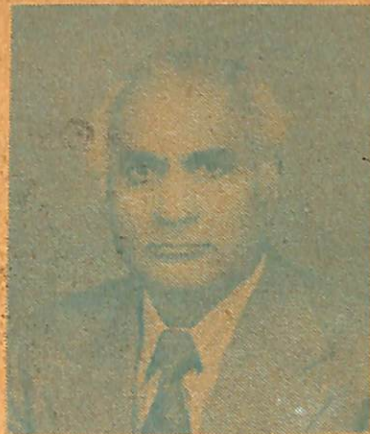

Baddi Pani
01795 | 44088
44089



گلزار



رفعت سلطان



فراز صدیقی



کرامت بخاری



محمود رحیم



شوکت مہدی

فون : ۲۳۰۸۰۷

ماہنامہ

تخلیق

لاہور

جلد۔ ۲۴ • فروری ۱۹۹۳ء • شمارہ۔ ۲

مدیر : اظہر جاوید

قیمت فی پرچہ ——— دس ۱۰ روپے
سالانہ ——— پچاس ۵۰ روپے

بھگوان سٹریٹ، پرانی انارکلی، لاہور

ترتیب

انتخابات		۵
میاں محمد بخش کا تصوّرِ حسن	یوسف حسن	۷
نسائی شاعری میں گھر کا تصوّر	قرۃ العین طاہرہ	۱۱

نظمیں۔ گیت

دھرتی کا لمس	احمد ندیم قاسمی	۱۷
دُعا	قتیل شفائی	۱۸
شاخِ نہالِ غم	غلام جیلانی اصغر	۱۹
گیت	ناصر شہزاد	۱۹
انسان	گلزار	۲۰
مکالمہ کچھ دُکھا ہُوا ہے	اسلم طارق	۲۱
میں گڑیوں سے نہیں کھیلی	منصورہ احمد	۲۱
نئے سال کی دُعا	ماہ طلعت زاہدی	۲۲
جنگل میں رات	اختر ضیائی	۲۳
میں نئیں سب توں	محمود رحیم	۲۴
خالق نہ بنو	خالد خواجہ	۲۴

افسانے

کہانی بدلتی ہے	ہرچرن چاولہ	۲۵
بچھڑ جانے کا موسم	شمس نغمان	۳۱
دَن ٹُو ٹھری	امینہ عنبریں	۳۹
بلائنڈ ڈیٹ	سیّدہ عبیدہ	۴۳

غزلیں

۴۹ — ۶۵

کرم حیدری، اکبر کاظمی، انور سدید

تابش صمدانی، انوار فیروز، فراز صدّیقی

ضیاء علیگ، حفیظ الکبیر، سرور کاشمیری

احمد شریف، بشیر سیفی، سعید کوکب

کاوش عباسی، این اے صوفی، سجاد مرزا

صفدر جعفری، کرامت بخاری۔ غزالہ نثار

شوکت مہدی، اطہر ناسک، شفیق آصف

شاہین کرن، تسنیم عابدی، شیریں حسن

امتیاز الحق امتیاز، اطہر قیوم راجہ، اکرم عتیق

نواز شاہد، آسناتھ کنول، محمد حسین کنول

سفرنامے

جان نواز کوچے	رام لعل	۶۷
سیکس کرنسی	سلیم اختر	۷۲

جائزے

بہتر دُنیا کی تلاش	جیلانی کامران	۷۹

پنجاب رنگ

ککھ دا شوق، ککھ دا ذوق	اسلم راتا	۸۳
غزل	رفعت سلطان	۸۹
پال دے قتل دی خبر سُن کے	افتخار نسیم	۹۰
تت ماہی لوڑی داہ وچھوڑا ماہی دا	بشریٰ اعجاز	۹۱

تبصرے

۹۳ - ۱۰۴

انجمنِ خیال

(خطوط) ۱۰۵ - ۱۱۸

سرورق

اسلم ملک

- ناشر: اطہر جاوید
- طابع: فروغ احمد
- مطبع: طیبہ پرنٹرز۔ لاہور
- مقامِ اشاعت: میکلیگن روڈ۔ لاہور
- خوش نویس: سیّد حامد علی شاہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اپنی بات

فیضؔ نے کہا تھا ع

یُوں نہ تھا، مَیں نے فقط چاہا تھا یُوں ہو جائے

مُجھ ایسے بندوں کے ساتھ ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے۔ میں محبّت کا حوالہ دیتا رہتا ہوں۔ 'محبّت' جو اللہ کی سوغات ہے، مگر میں نے خیرات کی طرح مانگی ہے۔

محبت ہی کے حوالے سے، گزشتہ شمارے میں، مَیں بہت بڑا دعویٰ کر بیٹھا تھا۔ اس بار بھی ناکام ہُوا ہوں۔ میں نے کہا تھا، ادب (اور تخلیق) میں جو نفرت کی پیکار جاری ہے، میں اسے محبّت کا رُوپ دینے کی کوشش کروں گا اور انشاء اللہ ۹۳ء کے سال میں محبّانِ ادب کو کوئی نوید دوں گا۔

میں نے کوشش کی تھی۔ بڑے نام کے بڑے لوگوں کی انا کی حویلیوں کے بڑے دروازوں پر نیازمندی سے دستک دی تھی۔ جواب مُثبت نہیں ملا۔ کچھ اور تلخ تجربے ہوئے ہیں۔ پہلے سوچا تھا، ادبی ریکارڈ کی سہولت اور دُرستی کے لئے انہیں آپ تک پہنچا دوں۔ مگر جناب قتیلؔ شفائی کا کہنا ہے۔ ایسا نہ کروں۔ میں اُن کے کہے کو حُکم کا درجہ دیتا ہوں۔

شاید کل کلاں کو، وہ خود محسوس کریں کہ اس "سعیٔ رائیگاں" کو منظر پر فرور آنا چاہیئے۔ کیونکہ اِس سے کچھ اور پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ پہلو، جو ابھی تک تاریک ہیں۔

دیانت اور نیک نیتی کا یہی تقاضا ہے، اگرچہ بعض اوقات "بہت اپنے" بھی شک میں مُبتلا ہو جاتے ہیں اور بدگمان ہو کر ایسا فیصلہ کر گزرتے ہیں، جو ہونا نہیں چاہیئے۔ حفیظؔ جالندھری نے کہا تھا .... ع

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف

اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

صوفیاء نے سلوک کی راہ میں آنے والے تشکیک سے ہمیشہ پناہ مانگی ہے۔ مگر....

اور یہ "مگر اور اگر" تو پھر بہت سی اَن چاہی دراَن کہی کہانیوں کی طرف لے جاتے ہیں ــــ!

اظہر جاوید



Adarts-JOS-1/92

میاں محمّد بخش کا تصوّرِ حُسن

یوسف حسن

میاں محمد بخش (۱۸۲۶ء - ۱۹۰۷ء) ریاست جموں وکشمیر کے صوبہ جموں کے رہنے والے ایک عظیم پنجابی شاعر کی حیثیت سے اپنے صوبہ جموں سے باہر پنجاب میں بھی نہایت مقبول ہیں۔ ان کی شاعری پنجاب ہی کی پنجابی شاعری کی مرکزی روایت کا تسلسل اور اس کی توسیع ہے۔ اور یہ مرکزی روایت وحدت الوجودی تصوّف کے تصوّرات و واردات کے زیادہ تر پنجاب کی اپنی فطری اور تہذیبی تمثالوں اور پنجابی انداز میں اظہار پر مبنی ہے۔

میاں محمد بخش اپنی ایک شعری تصنیف مرزا صاحباں میں لکھتے ہیں :-

ع مدح حسن دی وچ تے ورد اندر میٹھوں جاوندے نہیں ہدار کیتے

چنانچہ ان کی شاعری حسن کی مختلف صورتوں اور ان کے تصوّرِ حسن کا اظہار بھی ہے اور شعری حسن آفرینی کا ایک لازوال مظہر بھی۔ سیّد علی عبّاس جلالپوری کہتے ہیں کہ

"حسن کے اظہار کی تین صورتیں تسلیم کی گئی ہیں۔ صوفیاء حسنِ ازل کو چوتھی صورت قرار دیتے ہیں۔ فطری مناظر کا حسن، حسنِ نسوانی اور حسنِ ادا یا اسلوبِ فن کا حسن۔"

(مجلّہ فنون (غالب نمبر) لاہور۔ مئی جون ۱۹۶۹ء، ص۔ ۶۲)

میاں محمد بخش چونکہ ایک صوفی شاعر ہیں اس لئے وہ حسنِ ازل کے وجود کے بھی قائل ہیں۔ یہ نظریہ وحدت الوجودی تصوّف کی بھی اساس ہے۔ اور سیّد علی عباس جلالپوری کے مطابق ــــ

" اس کا سب سے بڑا شارح سکندریہ کا نو اشراقی فلسفی فلاطینوس تھا۔ وہ کائنات کے تمام مظاہر کو حسنِ ازل کی تجلی گاہ سمجھتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ حسن و جمال خواہ کسی روپ میں ہو، حسن ازل ہی کا عکس ہے۔"

(مجلّہ "فنون" (غالب نمبر) لاہور، مئی جون ۱۹۶۹ء۔ ص۔ ۶۱)

میاں محمّد بخش کے وحدت الوجودی تصوّرِ حسن کے مطابق اللہ تعالےٰ کی ذات ہی حسنِ مطلق اور حسنِ ازل ہے اور انسانوں سمیت کائنات کے سارے مظاہر میں اسی حسنِ مطلق یا حسنِ ازل کا پرتو ہے جس کی کشش دردِ عشق پیدا کرتی ہے۔ اپنی معروف تصنیف

سفر العشق (سیف الملوک) میں کہتے ہیں۔

ے جلوۂ حسن گھنے دا دسدا ہر وچ ہر دا پھیرا
ایتویں نہیں محمّد بخشا دل دا حسن لٹیرا!

ے جے کر صورت وچ نہ ہوندا مالک آپ دلاں دا
غلیوں جھک مہار دلاں دی کیہڑا جیو ملاندا

ے ہر ہر وچ نہ ہوون جے کر ہر دے روپ سمانے
دانش منداں دا دل ٹھگن کد معشوق ایانے

اور ے توڑے بہتے روپ دسیون توڑے تھوڑے تھوڑے
اصل اندر سبھ ہک ہوون گے نذلوں نیر وچھوڑے

میاں محمّد بخش کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوقات میں حسین ترین ہستی انسان کی ہے۔ اور انسان کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ

ع آدم باہجوں دھرت نہ سوہجے، زیب زمین دا ایہی

یا پھر ع شان انسان حیوان بھلے دا ملکاں نالوں اگے

اور نوعِ انسانی میں حسن و جمال کا بلند ترین مرتبہ محبوبِ خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔ لہٰذا عشقِ رسول، عشقِ خدا ہی کا واسطہ ہے اسی حوالے سے میاں محمّد بخش، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف میں کہتے ہیں کہ

ے دوزخ جنت وچ اسماناں جو خلق اللہ دی وسدی
پاک جمال تساڈے کارن ہر دی جان ترسدی

ے عشق ترے وچ گھائل ہوئے مائل حسن ازل دے
سر دتے "پر سی نہ کیتی شادی کر کر چلدے

میاں محمّد بخش کے خیال میں حسن ازل تک رسائی مرشد کی راہ نمائی دل کی بیداری ہی سے ممکن ہے۔ چنانچہ انھوں نے "سفر العشق" (سیف الملوک) میں شہزادہ سیف الملوک کو انسانی روح اس کے والد شاہ عاصم کو مرشد کی اور شہزادی ملکہ خاتون کو دل کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ سیف الملوک کو دو شاہ مہروں کی صورت میں شاہ عاصم سے راہ نمائی ملتی ہے۔ جو صدق اور محبّت کی علامتیں ہیں اور جب ملکہ خاتون طلسمی نیند سے بیدار ہوجاتی ہے تو سیف الملوک کو بدیع الجمال تک رسائی ہوجاتی ہے۔ بدیع الجمال حسنِ ازل کی علامت ہے۔

میاں محمّد بخش وحدت الوجودی تصوّرِ حقیقت کے تحت ہی انسان اور فطرت دونوں میں حسنِ ازل کی جھلک دیکھتے ہیں اور اس کو اپنی شاعری میں موقع و محل کے مطابق تفصیل یا اجمال کے ساتھ بڑے شغف سے پیش کرتے ہیں۔ انسانی حسن بالعموم اور اس میں نسوانی حسن بالخصوص ان کا موضوع ہے۔ انھوں نے اپنی تصانیف سفر العشق، سوہنی مہینوال، مرزا صاحباں، سسّی پنوں اور ہیر رانجھا میں مرکزی کرداروں کے ساتھ ساتھ دوسرے اہم کرداروں کی بھی عمدہ سراپا نگاری کی ہے۔ اور اس

سراپا نگاری میں حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ وہ مردانہ کرداروں میں جمال کے ساتھ جلال کو بھی ابھارتے ہیں جب کہ ان کے بیشتر نسوانی کردار لطافت و نزاکت کے مثالی نمونے ہیں۔ ان کا نسوانی حسن کا تصوّر ایرانی اور پنجاب و جموں کی خصوصیات کے امتزاج سے صورت پذیر ہوا ہے۔ چنانچہ ان کے نسوانی کرداروں کے قد لمبے، چہرے روشن، ہونٹ سُرخ اور پتلے، آنکھیں بادامی، ناک ستواں، پیشانیاں کشادہ اور ان پر بندیاں، سیاہ زلفیں اور ان میں پیچ اور مینڈھیاں ہیں۔ انھوں نے سراپا نگاری میں بھی ایرانی اور مقامی دونوں طرح کی فطری اور تہذیبی تشبیہات سے کام لیا ہے۔ "سفرالعشق" میں بدیع الجمال کا سراپا بیان کرنے سے پہلے باقاعدہ وضاحت کرتے ہیں کہ

ے جیویں محبوباں دی گل دسرا نظمی مرد حسابی!
کجھ کجھ ڈول ہووے گی اوہو کدھرے ہوگ پنجابی

ے جو چوریاں دی لذت بھتی نرے اسلے ماسوں
لذّت دار سلونا بھائی لوؤ محمّد پاسوں!

چوجرے سبزی یا گوشت کے سالن کو کہتے ہیں جو میاں محمد بخش کے نزدیک سادہ گوشت کے سالن سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ گویا وہ نرے ایرانی سراپا کی بجائے ایرانی اور مقامی حسن کے امتزاجی روپ کو زیادہ مؤثر جانتے ہیں۔ بدیع الجمال کے حسن کے بعض پہلوؤں کی پیش کش دیکھئے۔ کہتے ہیں۔

ے کنڈل دار دو زلفاں سر تے کالے ناگ ڈنگالے
ہر مینڈھی سر کڈھے جیوں کر لیشئر جیبھ نکالے

ے خوب بدامی اکھیں بھائی چیر میاں انب پھاڑی
کجّل کنک مٹک سہاوے جیوں کر یک اُجاڑی

ے پتلا چم سفید تشکم زا جیوں کاغذ کشمیر دی
ریشم قسم اچّی دا یاسی لچھا سوت حریر ول

میاں محمد بخش کو اپنے وحدت الوجودی تصوّر کے رشتے ہی سے فطری مناظر و مظاہر کے حسن و جمال سے بھی گہرا لگاؤ ہے اور ڈاکٹر غلام حسین اظہر کے بقول ــــ

"اس رویے کی بدولت خواجہ فرید اور میاں صاحب نے مظاہر فطرت کی عکاسی کا بھی حق ادا کیا ہے۔ خواجہ فرید کے یہاں روہی اور چولستان کا حسن پُر تو فگن ہے تو میاں صاحب کے یہاں کشمیر کا فطری حسن و جمال۔ جمال پسندی ان کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔" (میاں محمد بخش۔ ۱۹۸۹ء۔ ص ۴۷)

میاں محمد بخش کا مشاہدہ بہت وسیع ہے اور ان کی تصانیف میں اپنے وطن جموں و کشمیر کے ساتھ ساتھ پنجاب کے فطری مناظر و مظاہر کے خوبصورت لفظی مرقعے بھی ملتے ہیں۔ وہ عام طور پر فطری حسن کا بھی تہذیبی تشبیہی تمثالوں کے ساتھ اظہار

کرتے ہیں۔ اور فطرت کے ساتھ جموں وکشمیر اور پنجاب کی تہذیب کو بھی اجاگر کرتے چلے جاتے ہیں۔ "سفر العشق" سے چند اشعار دیکھئے:

ے ہتھ کھلار چنار کھلوتے زاہد ہار کنارے
کرن دعائیں مولا سائیں پوری دکھاں کے مارے

ے رنگا رنگ بہار پھلاں دی جیویں گوڑیاں وچ میلاں
بھر بھر بیچ پھلاں دے کڈھن دیلاں دین رویلاں

ے ہوا بہاڑاں پنکھی بولن تھاں تھاں لا کچہری
سوہے ساوے چٹے کالے تتری رنگ سنہری

انھوں نے فطرت کے محض ایک دو شعبوں اور ان کی ..... تمثالوں کی بجائے تقریباً سارے فطری شعبوں کی مخصوص تمثالیں کثرت سے پیش کی ہیں۔

میاں محمد بخش نے اپنی تصانیف میں شعری حسن ادا کے متعلق اپنے تصوّرات بھی جگہ جگہ بیان کئے ہیں۔ وہ شعری حسن ادا کو شعری تجربے کی مطابقت میں دیکھتے ہیں اور شخصی تجربہ ان کے نزدیک سچی شاعری کی اساس ہے۔

ے ہر دا تے جس حال سنائے لعل جواہر اوہا
جس اسمتر سنی سناتی مل اوتھاں دا لوہا

شعری حسن ادا میں وہ بیان کی صفائی، لطافت، تہ داری، تازہ کاری، ترنم و نغمگی اور پختگی کو خاص طور پر سراہتے ہیں۔ چند اشعار، جن سے ان اوصاف میں سے بعض کی پسندیدگی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ہیں:

ے پنکھی خوش آواز ہزاراں جو باغاں وچ بولن
شاعر گھنے انھاں بھیں ہوئے سخن جواہر تولن

ے مقبل دی گل سدھی سادی ہے مقبول پیاری
لفظ کمیں تے معنے بہتے یاد رکھن دی کاری

ے رانجھا برخوردار سنی دا بلبل باغ سخن دی
شعر اوہدا جیوں واؤ فجر دی آتے باس چمن دی

ے جس وچ گجھی رمز نہ ہووے دردمنداں دے حالوں
بہتر چپ محمد بخشا سخن اجیہے نالوں!

میاں محمد بخش کی شعری تصانیف جمالِ الٰہی، حسنِ انسانی، حسنِ فطرت، اور حسنِ اسلوب شاعری سے ان کی گہری وابستگی کا اظہار بھی ہیں اور معنوی اور صوری حسن آفرینی کے زندہ جاوید نمونے بھی۔ جن سے کروڑوں پنجابی خواں ہمیشہ لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔

نسائی شاعری میں گھر کا تصوّر

قرۃ العین طاہرہ

ہم کس مقام پر ہیں، یا ہمیں کس مقام پر ہونا چاہئے۔ یا مقام کا تصوّر ہی نہیں ہے۔ یہ تین سوال عورت کی زندگی میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اگر وہ سوچتی ہے کہ ہمیں ہمارا حق ملنا چاہئے۔ ہماری خدمات کا اعتراف کیا جانا چاہئے۔ ترقی کی راہ پر بڑھتے ہوئے قدموں تلے کانٹے نہیں بچھنے چاہئیں اور اسی طرح کے اور بہت سے "مطالبات" — تو یہ بات مرد کے بنائے ہوئے معاشرے میں رہنے والوں کو سخت گراں گزرتی ہے۔ اگر وہ صرف اپنے مقام کا تعیّن چاہتی ہے کہ آج وہ کس مقام پر کھڑی ہے۔ کیا اس کے حقوق پورے ہو رہے ہیں۔ اُسے آزادی نصیب ہے کہ وہ اپنی مرضی سے سوچ سکے۔ فیصلہ بھی کر سکے کہ آزادیٔ فکر، آزادیٔ اظہار اور آزادیٔ عمل ان کے بغیر کوئی کام خواہ وہ دنیا سے متعلق ہو یا عورت کی مختصر سی کائنات، اس کے گھر سے تعلق رکھتا ہو، احسن طریقے سے سر انجام نہیں دیا جا سکتا۔ وہ ان سوالوں کے جواب سوچتی ہے تو وہ نفی میں ہوتے ہیں۔ وہ صرف سوچ سکتی ہے۔ اپنی حالت پر افسوس کر سکتی ہے اور کچھ نہیں — اُسے اس بات کا بھی احساس ہے کہ کاش وہ ذہنی سطح پر اتنی باشعور نہ ہوتی کہ اسے اُن حقوق کا علم ہو پاتا۔ اُسے ڈگریوں کے بوجھ سے زیادہ اپنی سوچوں کا بار مارے ڈالتا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ اگر مرد کے بنائے ہوئے اس معاشرے میں اُسے وہی کچھ کرنا اور سہنا تھا جو عورت صدیوں سے کرتی چلی آئی ہے تو اس نے علم کے حصول میں اپنی زندگی کے پندرہ سولہ سال خواہ مخواہ ضائع کئے۔ تعلیم نے اُسے فکر و شعور بخشا۔ دنیا میں ہونے والے واقعات کے تجزیہ کا ہنر سکھایا۔ ظلم اور ناانصافی عورت کا مقدر رہی ہے۔ اس کے خلاف آواز بلند کرنے کا طریقہ بتایا۔ مرد سے صرف اپنے دکھ مجھے دے دو۔ مانگنے کے بجائے اس کی خوشیوں میں حصّہ دار بننے کا ارادہ کیا۔ لیکن وہ دیکھتی ہے کہ علم نے اس کا شعور بیدار کر کے اس کے حق میں کچھ بہتر نہیں کیا۔ وہ اپنا سب کچھ تج کر بھی مرد سے اپنے ہونے کی گواہی نہ لے سکی۔

؎ کیسا عجیب سارا سفر زندگی کا تھا! ؏ جتنا عذاب روح تھا سب آگہی کا تھا (سعدیہ نسیم)

بہر حال وہ اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ اس سے بہتر تو وہ اس حالت میں تھی جب اس کے ذہن میں مقام کا کوئی تصوّر ہی نہ تھا۔ اور جب وہ مقام یا اہمیت کی بات کرتی ہے، اس سے اس کا مقصد صرف یہی ہوتا ہے کہ گھر میں اس کا کیا مقام ہے۔ کیونکہ اگر گھر میں اسے اہمیت دی جائے گی۔ تو معاشرہ خود بخود اُسے اہم فرد کا درجہ دے گا۔ وہ سوچتی ہے کہ اسے اس غور و فکر، عقل و شعور کے انمول خزانوں سے نکال کر، مرد نے علم کے زیور کے بجائے اُسے سونے چاندی کے زیورات

سے آراستہ کرتے اُس پر احسان کیا ہے اور اپنی کامیابی پر نازاں ہے۔

میں دفن رہوں اب یونہی ریشم کے کفن میں
اب اُس کے سوا اور تو صورت بھی نہیں ہے (شبنم شکیل)

اب اسے اس ریشم و کمخواب کے بیش قیمت لبادے (یا عورت کی نظر میں کفن) کے بدلے اسے مرد کا ہر حکم اور ہر ظلم خاموشی سے سہنا تھا۔ یہی اس کا حق تھا۔ یہی اس کی حیثیت اور یہی اس کی معراج۔ وہ اپنے فرائض پوری تندہی کے ساتھ، اپنی ذات کی پروا کئے بغیر انجام دے رہی ہے۔ اس کی ذات کی نفی کچھ تو مرد نے کی اور کچھ خود اس نے اپنے ہاتھوں کی کہ اس کے بغیر زندگی بہت کٹھن تھی۔ اور یوں اپنی ذات و انا کا احساس واضح ہی نہ ہو پایا۔

میں نے اُن سب چڑیوں کے پر کاٹ ڈالے ؎ جن کو اپنے اندر اڑتے دیکھا تھا (شاہدہ حسن)

ہماری شاعرہ نے عورت کے ان تین درجوں کا مطالعہ کیا ہے۔ عورت کی دنیا اس کے گھر کی چار دیواری تک محدود ہے۔ آج کی شاعرہ اسی دنیا کا تجزیہ کرتی ہے کہ عورت اپنے گھر میں خوش ہے۔ قید ہے۔ محفوظ ہے یا مجبور ہے۔ گھر کو وہ پناہ گاہ تصور کرتی ہے یا زنداں سے عبارت کرتی ہے۔ گھریلو ذمہ داریاں اس کے ماتھے کا جھومر ہیں یا پاؤں کی بیڑیاں۔ گھر اُس کے خوبصورت سپنوں کی تعبیر ہے یا پنڈورہ باکس۔ گھر میں اس کی حیثیت ایک مالکہ کی سی ہے یا خادمہ کی۔ اور خادم بھی بلا معاوضہ۔ آج کی شاعرہ عورت کے گزرتے لمحوں اور آنے والے وقت کا حساب رکھتی ہے۔ عورت ہی عورت کے ہر دُکھ اور سُکھ کو بخوبی سمجھ سکتی ہے۔ یوں آج کی نسائی شاعری عورت کے انہی دُکھوں اور سکھوں کا نوحہ اور نغمہ ہے۔ عورت کو دُکھ چھپانے میں کمال حاصل ہے۔ ہنسی کی شدت سے اس کی آنکھوں میں آتے ہوئے آنسوؤں کو کیا معنی دیئے جائیں اور اگر دکھی بھی ہے تو اپنے دُکھ کا اعتراف کبھی نہیں کرے گی کہ الزام اُسی کے سر آئے گا۔ اسی لئے وہ غموں کی نمائش کے بجائے انھیں سب سے چھپا کر رکھتی ہے۔

مجھے خبر ہے میرے گھر میں سانپ آ نکلے ہیں! ؎ مگر نہ میں نے خزینے چھپا کے رکھتی کیوں (کشور ناہید)

معاشرے کی تشکیل و تعمیر میں کہا جاتا ہے کہ عورت کا برابر کا حصّہ ہے۔ لیکن اس بات کو درست کیسے مان لیں۔ گر ایسا ہوتا تو خواتین آج گھر تک محدود ہونے کے بجائے مرد کے ساتھ زندگی کے دوسرے مسائل کے حل میں معاون ہوتیں۔ لیکن مرد کو یہ بات گوارا نہیں۔ انھیں خوف ہے کہ عورت کہیں ذہنی سطح پر ان کی برابری کا دعویٰ نہ کر بیٹھے۔ وہ عورت کے حسن سے ہمیشہ متاثر اور اس کی ذہانت سے ہمیشہ خائف رہے ہیں۔

مجھ کو میرے عکس سے بڑھتے نہیں دیتا تھا وہ ؎ میرے اور دنیا کے بیچ اک آئینے جیسا تھا وہ (شہناز پروین سحر)

عورت ... گھر کے مکینوں میں ایک فعال رکن .... ضرور ہے۔ لیکن حقدار نہیں کہ عورت تمام زندگی اپنے باپ، شوہر یا بیٹوں کے گھر میں رہتی ہے۔ اس کا اپنا گھر شاید کوئی بھی نہیں۔ پھر بھی گھر بنانے اور سنوارنے کی خواہش اسے تمام عمر پاگل کئے رکھتی ہے۔ گھر اس کے لئے محبت سکون اور آشتی کا گہوارہ ہے۔

ویران ہی سہی پھول اُگا لوں گی یہیں پر! ؎ کافی ہے میرے واسطے، آنگن میرے گھر کا (رعنا ناہید عنا)

؎ سر پر کسی سائباں کی آہٹ ؛ دیوار کا زنگ سوچتی ہے (شاہدہ حسن)

وہ گھر جو اس کا اپنا نہیں، وہی اس کی چھتر چھاؤں ہے اور اس کی یادیں زندگی کا حاصل۔

؎ گھر چھوٹا تو گھر کی یادیں اب کیوں پیچھا کرتی ہیں
چھوڑے ہوئے وہ پیڑ وہ سائے ایک زمانہ بیت گیا (طاہرہ اسعدی)

عورت گھر کے تمام اہم اور غیر اہم امور بڑی تندہی دلچسپی محنت توجہ اور اپنا آپ پس پشت ڈال کر سرانجام دیتی ہے۔ لیکن کیا گھر میں درپیش کسی اہم یا غیر اہم مسئلے پر اس کی رائے لی جاتی ہے یا اس کے کسی فیصلے کا احترام کیا جاتا ہے۔ ان حالات میں جبکہ وہ گھر کے تمام مکینوں کی خدمت بہت محبت اور پیار سے کر رہی ہے۔ ذاتی پریشانیوں اور جسمانی تکالیف کسی پر ظاہر کئے بغیر۔ شاید اس زعم میں کہ اس کے بغیر گھر کا تمام نظم و نسق تباہ ہو جائے گا۔ اپنی تمام تکالیف کے باوجود گھر کو اپنی ذات پر اولیت دیتی رہی تمام تر حق سے دستبرداری کے ساتھ۔ گھر کے لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی تنہائی کے دوزخ میں جلتے ہوئے اکیلے پن کے دُکھ جھیلتے ہوئے ذہنی عدم مطابقت اور کچھ اپنی کم مائیگی کے احساس نے اسے سب سے الگ اور تنہا کر دیا ہے۔ وہ اپنے اندر کی خاموشی اور باہر کے سناٹے سے سمجھوتہ کر چکی ہے

؎ آنکھوں میں اُترا ہے بام و در کا سناٹا ؛ میرے دل پہ چھایا ہے میرے گھر کا سناٹا (پروین شاکر)

گھر کے سناٹے سے گھبرا کر وہ باہر قدم اس لئے نہیں نکال سکتی کہ اس کے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی ہے کہ باہر کی دنیا ایک مختلف دنیا ہے۔ جہاں انسان نہیں بھیڑیئے بستے ہیں۔ عفریتوں کا سایہ ہے۔ حرص و ہوس کے اژدہے ہر وقت منہ کھولے عورت کو نگلنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ وہ شوق یا ضرورت کسی بھی وجہ سے قدم باہر نکالے گی تو چہار جانب سے تکتی گرسنہ نگاہیں اسے غیر محفوظ ہونے کا احساس دلائیں گی۔ عورت اگر محفوظ ہے تو صرف گھر کی چار دیواری میں۔ اس کی اصل پناہ گاہ اس کا گھر ہے۔ یہ تو ہے مرد کی سوچ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عورت کس انداز میں سوچتی ہے۔ کیا وہ بھی گھر کو پناہ گاہ تصور کرتی ہے کہ جس کی چھت تلے وہ تمام مصائب سے آزاد ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اس پناہ گاہ کو اپنی ذات اور ذہن کے لئے ایک زنداں قرار دیتی ہو۔ شاعرہ معاشرے کا حساس ترین فرد ہے۔ وہ بات کہنے کا سلیقہ جانتی ہے تو ایسے ہی اُسے خاموش کرانا خود اس پر بھی ظلم ہے اور ان عورتوں پر بھی جو کچھ کہنا تو چاہتی ہیں لیکن کہہ نہیں پاتیں۔ ہماری شاعرہ گھر کی محافظت سے مطمئن بھی ہے اور مرد کی محبت سے مسرور بھی، لیکن کن حالات میں کہ اس کی آنکھوں کے اشارے سے وہ اپنے تمام فیصلے لمحہ بھر میں تبدیل کر لیتی ہے۔

؎ ترے لئے تقدیر میری جنبشِ ابرو! ؛ اور میں ترا ایمائے نظر دیکھ رہی ہوں (ادا جعفری)

؎ حرف اس کے نطق اس کا، زبان بیاں بھی وہ ؛ میری بیاض، میرا قلم بھی اُسی کا ہے (سیدہ حنا)

اس کا یہ محتاط رویّہ اس معاشرتی گھٹن اور خوف کا آئینہ دار ہے جو اس عہد کی عورت کو ورثے میں ملا ہے۔ کبھی کبھی وہ ان بندشوں سے، ہر لمحے مرد کی مرضی اور خواہش کا خیال رکھنے سے تنگ بھی آ جاتی ہے۔ اتنی پابندیوں سے اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ دماغ کی رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ وہ اس ماحول سے باہر نکلنا چاہتی ہے۔ کھلی فضا میں سانس لینا چاہتی ہے۔ اس گھٹن اور حبس سے فرار چاہتی ہے جو اسے شدید ڈپریشن میں مبتلا کئے دے رہے ہیں۔ وہ باہر کی دنیا میں ہونے والے واقعات

اور رفتارِ زمانہ سے آگاہ ہونا چاہتی ہے۔ ایسے میں وہی گھر اسے پناہ و پیار کی منزل کے بجائے زنداں محسوس ہونے لگتا ہے کہ جہاں کی صبحیں شامیں ایک سی ہیں۔

ے یہ گھر ہے یا کسی زنداں کی چار دیواری ؛ سحر دکھائی نہ دے، شام کا پتہ نہ لگے (رشیدہ سلیم سیمیں)

بڑے خلوص سے کاٹی ہے قیدِ تنہائی ؛ قفس ہی اب تو مجھے اپنا آشیانہ لگے (")

اپنے گھر میں عورت ماں بہن بیٹی اور بیوی کے روپ میں زندہ رہی۔ اُسے عورت کے وجود میں کبھی قابلِ اعتناء نہ سمجھا گیا۔ ادھر گھر میں رہنے والے مرد باپ بھائی شوہر یا بیٹے کے رشتے کے تحت عورت پر برتری کا حق رکھتے ہیں کہ برابری اور مساوات کا ذکر کتابوں میں ہی بھلا لگتا ہے۔ جس طرح ہمارے معاشرے میں عورت کو دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا یہی حال گھر میں ہے۔ پھر بھی خوش ہے، پرسکون ہے۔

ے جھوٹا کھایا، اور جھوٹے برتن دھوئے ؛ ہنس کے عمر گزاری یوں انجانے سے (کشور ناہید)

عورت کا اوّلین مقصدِ حیات تخلیقِ آدم اور پھر تربیتِ آدم ہے۔ تخلیق کے کرب انگیز لمحات اسے مسرت اور تکمیل کا وہ احساس بخشتے ہیں کہ عورت تمام زندگی اسی فخر میں گزار دیتی ہے کہ نسلِ انسانی کی تشکیل و تعمیر اس کے وجود کے بغیر ممکن نہیں۔ عورت کی شاعری ماتا کی شاعری ہے۔ وہ اپنی زندگی کے کڑوے لمحے ان مہکتے گلابوں کی خاطر مسکراتے ہوئے جھیل جاتی ہے اور اسی مرد کی ممنون بھی ہے کہ جس نے اُسے زندگی کے یہ لازوال تحفے عطا کئے۔ وہی اس کا حال اور وہی اس کا مستقبل ہیں۔

ے میری آغوش میں جو ہمکتا ہے وہ چاند ؛ مرے فردا کے خوابوں کی تعبیر ہے (ادا جعفری)

ے میرے آنچل کے سارے خار چنے ؛ اور میری گود میں گلاب دیئے (زہرہ نگاہ)

عورت علم و ہنر حاصل تو کر لیتی ہے۔ لیکن ان سے فائدہ اس لئے نہیں اٹھا پاتی کہ مرد ان کی محنت لگن شوق اور صبر و استقامت سے خوف زدہ ہیں کہ ان خوبیوں کی وجہ سے وہ ان سے آگے نہ بڑھ جائیں۔ لہٰذا ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح انھیں باہر کی دنیا میں عملی قدم رکھنے سے روک دیا جائے۔ اس کے لئے وہ کئی طریقے استعمال کرتے ہیں۔ پیار، محبّت، نرمی، غصّہ، ناراضگی دھمکی۔ سبھی ہتھیار ان کے پاس ہیں۔ لیکن پھر بھی خوف زدہ ہیں۔

ے پَر کاٹے، گردن کاٹے، پھر بھی کانپے ؛ ڈرتا ہے صیّاد میری پروازوں سے (شمیم سہگل)

اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتے تو خواتین پر تنقید کرتے ہیں کہ وہ دل برداشتہ ہو کر گھر بیٹھ جائیں لیکن وہ باہر کی کھلی فضا میں رہ کر اپنے اعتماد، ذہانت اور مضبوط کردار کی بدولت ان تمام نامساعد حالات پر قابو پا لیتی ہے۔

ے بے وجہ تحفظ کی ضرورت بھی نہیں ہے ؛ ایسی میرے اندر کوئی عورت بھی نہیں ہے (شبنم شکیل)

یہ عورت کے اپنے ظرف پر منحصر ہے کہ وہ گھر کی دنیا سے نکل کر کام کریں تو اپنی شخصیت اور وقار کو کبھی مجروح نہ ہونے دیں۔ ظاہر ہے انھوں نے اچھی حالات میں اپنی صلاحیتوں کو منوانا ہے۔ عورت کو اتنا لاچار اور بے بس نہیں ہونا چاہئے کہ کوئی اس کا استحصال کر سکے۔ اور یہ عورت کی اضافی قابلیت ہے کہ وہ گھر کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ معاشی جدوجہد میں بھی مرد کا ہاتھ بٹا رہی ہے۔ اس سخت کوشی کے باوجود اُسے محبّت خلوص اور نزاکت کا پیکر سمجھا جاتا ہے کہ جس کی تخلیق کا مقصد اولادِ آدم کو

پڑ جاتا ہے۔ مرد نے عورت کے لئے ایسا ماحول تشکیل دیا ہے کہ وہ خود بھی اس چکر میں پھنس کر رہ گئی ہے کہ اس دن میں اپنے آپ کو بہت اچھی لگی۔ وہ جو تھک کر دیر سے آیا، اسے کیسا لگا۔ ذرا سی تکلیف پر وہ اپنے سارے دکھ اور ساری تھکن بھول جاتی ہے۔ تکلیف برداشت کرنے کی صلاحیت عورت میں موجود ہے۔ اور گھر کو بکھرنے سے بچانے کے لئے وہ جان سے گزر جاتی ہے مرد کے اس معاشرے میں عورت کی مظلومی کو مرد پسند کرتا ہے۔ اس کی خوشی کی خاطر وہ اپنی مظلومی کو کبھی برتری میں بدلنے کی خواہش نہیں کرتی۔ عورت کی تمام زندگی مکان کو گھر بنانے کی کوشش میں گزر جاتی ہے۔ اینٹ گارے اور پتھر سے بنائے گئے مکان کو گھر بنانے میں وہ اپنے پیار، محبّت اور ممتا کے دائمی رنگوں سے خوبصورت اور آرام دہ بنانے میں کوشاں رہتی ہے۔ یہی اس کی جنت ہے اور یہی اس کا گوشۂ عافیت کہ گھر سے چند لمحوں کی دوری میں بھی گھر کے خیال سے وہ کبھی غافل نہیں ہوتی۔ در و دیوار کی شکستگی اس کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی کہ اُسے اپنے خلوص اور محبت پر اعتماد ہے کہ وہ چھت کو کبھی گرنے نہ دیں گے۔

؎ شکستگی در و دیوار کی تھی اپنی جگہ
سکوں نواز بہت تھا کہ گھر تو اپنا تھا (رعنا ناہید رعنا)

ایک عورت کی سب سے بڑی خواہش 'اپنا گھر' ہی ہے۔ اس کے ہونے سے ہی کھلتے گلابوں اور مہکتی کلیوں کی رونق ہے یہی اس کی سب سے بڑی خوشی ہے۔

؎ کھلیں گلاب یہاں، تتلیاں کریں شوخی ؛ عجیب سی وابستگی ہے گھر سے تیرے (ارشاد ارشی)

حرفِ آخر یہ کہ نسائی شاعری میں گھر کا تصوّر پناہ گاہ کا ہو یا زنداں کا، وہ جس سے فرار چاہتی ہے اسی کی پناہ میں آنا چاہتی ہے کہ گھر کے بغیر وہ اپنے وجود کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی۔

احمد ندیم قاسمی

دھرتی کا لمس

لمس دھرتی کا نہ محسوس ہو جس شاعر کو
اس کا انسان کی سوچوں پہ کبھی بس نہ چلے

کیا خبر اس کو، کہ ویرانۂ دل میں کیسے
گرد باد اُٹھتے ہی اُڑ جاتا ہے صحرا کا قرار
اور اُفق تا بہ اُفق بنتے ہیں ٹیلوں کے مزار

اس کو معلوم ہی کیا، ذہن کے ایوانوں میں
کتنے فانوس جلے، جل کے بجھے، بجھ کے جلے
زندگی ایک ابابیل ہے، جس کا اک پر
کوئی صیّاد لئے بیٹھا ہے پاؤں کے تلے!

اس کو کیا علم، کہ اضداد کا مفہوم ہے کیا
کیسے تلوار بھی کھینچو تو کوئی اُف نہ کرے
اور اگر پھول بھی مارو تو سسک کر رہ جائے

کیا پتہ اس کو، کہ جذبے کے مسافر اکثر!
دن کی ظلمت میں بھٹکتے ہیں بعنوانِ اصول
رات کی دھوپ میں جل جاتے ہیں اُمیّد کے پھول
صبح کی دھند سے چھا جاتی ہے احساس پہ شام
گلستانوں میں اُلجھ جاتی ہے دامن سے ببول
ریگزاروں میں مہکتے ہیں بہاروں کے رسول

قتیلؔ شفائی

دُعا

اَے خدُا ہم کو توفیق دے
تیری مخلوق سے ہم محبّت کریں
اپنے اپنے وطن میں جو آباد ہیں اُن اقلیّتوں کی حفاظت کریں
مسجدوں، مندروں، گوردواروں، کلیساؤں کی دل سے عزّت کریں
اے خدا ہم کو توفیق دے

• •

تیری مخلوق میں کوئی مسلم ہے اور کوئی ہندو ہے اور خالصہ ہے، کوئی
تیری مخلوق میں آلِ عیسےٰ بھی ہے
اور کئی اُمتّیں اور بھی
اپنے اپنے عقیدوں پہ قائم جو رہ کر بھی پہچانتی ہیں تجھے
اور اپنا خدُا مانتی ہیں تجھے
کیونکہ وہ سب کی سب تیری مخلوق ہیں
سب کا خالق ہے توُ
سب کا مالک ہے توُ

• •

اَے خدا ہم کو توفیق دے
تیرے بندوں کے جو بھی عقیدے ہیں ان میں مُخل ہم نہ ہوں
تجھ کو جس نام سے وہ پکاریں ہمیں کوئی اُلجھن نہ ہو
اُن کے معبد جہاں بھی ہوں
جس ملک میں بھی ہوں
اُس مُلک کے لوگ ان کی حفاظت کریں
اپنی دھرتی پہ وہ آدمیّت کو ناکام ہونے نہ دیں
اپنے مذہب کو بدنام ہونے نہ دیں

• •

اے خدُا ہم کو انسان بننے کی توفیق دے
اے خدُا سب کو انسان بننے کی توفیق دے
ہم کو توفیق دے امن و تہذیب کی
سب کو توفیق دے امن و تہذیب کی
عدل و انصاف کی

• •

غلام جیلانی اصغر

شاخِ نہالِ غم

ذرا دیکھنا !
کوئی اور زخم نہ جی اُٹھے
کوئی اور داغ نہ جل اُٹھے
جو چراغِ شامِ فراق تھا، اسے طاقِ جاں پہ رکھا تو تھا
وہ جو بجھ گیا، تو مِرے سرِ یر کے معبدوں میں
چراغ کتنے ہی جل اُٹھے
ذرا سوچنا !
وہ بہار کیسے گزر گئی، جو نگارِ صبحِ جمال تھی
کئی عارضوں کا نکھار تھی
کئی نکہتوں کا جمال تھی
اُسے میں نے کتنا سنبھال کر تیری چاہتوں کے فریب میں
دلِ خوش خیال میں رکھ لیا
کبھی آؤ گی تو دکھاؤں گا
وہ جو زخم تھے، وہ بھی سِل گئے
وہ جو داغ تھے، وہ بھی مٹ گئے
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جو ہری تھی ویسی ہری رہی

ناصر شہزاد

گیت

عِلموں بس کریں او یار
سامنے تیرے زہر بھرے دن بے بس سوچ وچار
عِلموں بس کریں او یار
وید، وظیفے، مسجد، مندر، سب پرچھائیں رُوح کے اندر
جیون اِک گمبھیر سمندر عکس سبھی اوتار !
عِلموں بس کریں او یار
کُنج کریر میں کوئل کُوکے سُنج سریر میں بدرا شور کرے
باہر گرم تھپیڑے لُو کے عقل کے آگے دار
عِلموں بس کریں او یار
راول جوگ کے یوگ میں نچنا اوڑھ کے رُوپ پیا کا رچنا
نیاگ کی آس اساس سے بچنا ذات دوات کے پار
عِلموں بس کریں او یار
کشٹ، قبیلے، قوم کتابوں، اُونچی مسند شور شرابوں
علم حضوروں، حرف حسابوں، دل دولت داتار
عِلموں بس کریں او یار
ہاتھ نہ ساتھ، سہیلی سنگنا، بن پریتم کے خالی انگنا
بے پھل، سادہ کاغذ رنگنا، تو نجھ ہے ... کونج، کہار
عِلموں بس کریں او یار

گلزار
(بھارت)

انسان

نچ چھیلے گئے کہسار نے کوشش تو کی گرتے ہُوئے اِک پیڑ کو روکے،

مگر کچھ لوگ کندھوں پر اُٹھا کر اُس کو پگڈنڈی کے رستے لے گئے تھے کارخانے میں

فلک کو دیکھ کر چُپ رہ گیا کہسار بیچارا !

بہت نوچی ہے میری کھال انساں نے،

بہت چھیلے ہیں میرے سر سے جنگل اُس کے تیشوں نے،

مرے دریاؤں، میرے آبشاروں کو بہت ننگا کیا ہے اس ہوس آلود انساں نے

مرا سینہ تو پھٹ جاتا ہے لاوے سے،

مگر انسان کا سینہ نہیں پھٹتا۔

وہ پتھر ہے !

اسلم طارق

مکالمہ کچھ رُکا ہُوا ہے

بہت دنوں سے تمہارا میرا مکالمہ کچھ رُکا ہوا ہے کہ فرصتیں
خواہشوں کی بستی میں جا بسی ہیں !

اے میرے مَیں !
مجھ سے بات کر
میں خموش لمحوں سے ڈر رہا ہوں
پہاڑ کاٹو تو کیا بھروسہ کہ کوئی چشمہ نکل پڑے گا
گمان کیسا کہ گھر سے نکلے تو کوئی رستہ ہمارے ہمراہ چل پڑے گا
سفر کو پاؤں سے باندھ لینے کا حکم ہم تک پہنچ چکا ہے
مگر کبوتر جو خط کسی دوسرے کنارے سے لیکر آیا ہم اُس میں
اِس حکم کے علاوہ بھی کچھ عبارت کے
منتظر تھے
ہمیں بُلانا تو اپنی سطروں کو پھر سے تھوڑا سنوار لینا کہ اس
سے پہلی عبارتوں میں بھی حرف کم تھے
بہت برس بعد کاغذوں پر حروف لکھو تو اِن کی گنتی
درست رکھنا
مغالطے بھی عجیب دکھ ہیں کہ اِن میں اُلجھی طویل عمروں
کے رات دن گنتیوں کی تختی سے
مِٹ گئے ہیں
بقایا عمروں کی مہلتیں کتنے دن چلیں گی
بہت دنوں سے تمہارا میرا مکالمہ کچھ رُکا ہُوا ہے
اب آ کہ پھر سے مکالمے کا جواز ڈھونڈیں

منصورہ احمد

میں گڑیوں سے نہیں کھیلی

میں گڑیوں سے نہیں کھیلی
مرے بھائی
مری گڑیوں کی ٹانگیں اور بازو توڑ دیتے تھے
مرے آنگن میں اک سُورج کا گھر تھا
جہاں سارے کھلونے اور غبارے بھک سے اڑ جاتے

سُنا ہے سب کا اک بچپن تو ہوتا ہے
مرا بچپن کہاں ہے ؟
بھلا یہ کون ہے جو ہر گھڑی مجھ سے
مری ٹوٹی ہوئی گڑیاں
غبارے اور کھلونے مانگتا ہے ؟

سُنا ہے زندگی آغاز ہی بچپن سے ہوتی ہے
تو میری زندگی آغاز کب ہوگی ؟

ماہ طلعت زاہدی

نئے سال کی دُعا

جس جگہ اک ملک کی طاقت تلے
خلقت تری تاراج ہو
ایسی دنیا میں مجھے زندہ نہ رکھ
میرے خدا !
جس جگہ جمہوریت کے نام پر
اپنی بقا کا اہتمام اور سب کا قتلِ عام ہو
ایسی دُنیا میں مجھے زندہ نہ رکھ

میرے خدا !
جس جگہ پر بھیڑیوں کی ہو حکومت
عصمتیں کیچڑ میں لتھڑی ہوں
درندے دندنائیں فوجیوں، طاقت وروں کے روپ میں
مرد و زن، پیر و جواں، سب قطاروں میں ہوں مرنے کے لئے
سب کی قبریں کھُد رہی ہوں ساتھ ساتھ
ایسی دُنیا میں مجھے زندہ نہ رکھ

کان سُن سُن کر ہوئے بے جان
آنکھیں بھی مری پتھرا گئیں
اور منظر خون میں ڈوبے ہوئے ہیں
آگ کی لپٹوں میں ہیں شام و سحر

چائنا، جاپان، یورپ چُپ ہیں سب —
کچھ تماشہ گر ہیں ان میں
کچھ تماشہ دیکھتے ہیں
زندگی کے راستوں پر دُھول ہے
کشمیر روتا ہے ....
فلسطین و عراق و بوسنیا رو رہے ہیں،
مر رہے ہیں ....
ہنس رہے ہیں سارے وحشی
ہنس رہے ہیں سارے بے حس
ہنس رہی ہے ایک دُنیا ....
ایسی دُنیا میں مجھے زندہ نہ رکھ میرے خدا !

اختر ضیائی
(لندن)

جنگل میں رات

اہلِ ہوس کی گھات کو دیکھا
ہم نے جو جنگل رات کو دیکھا

خوف کا اُس میں پہرہ دیکھا — چاند کو ابر کٹہرہ دیکھا
پاؤں کی آہٹ، دل کی دھڑکن — جسم کی طاقت، رُوح کی الجھن
سانس بھی لینے پر تھا کھٹکا — گم صُم چُپ تھا، بُوٹا بُوٹا
ساکت جامد، ڈالی ڈالی — گھور سماں سہمی ہریالی
منظر سب رنگوں سے خالی — ہر جانب اک چادر کالی!
بینائی محدود ہوئی تھی — پہنائی نابود ہوئی تھی
سوچ سمجھ احساس کی گھائل — جبر کی اک دیوار سی حائل
گویا اک اُفتاد پڑی تھی — ہجر کی یہ منحوس گھڑی تھی
حبس تھا یُوں مایُوس فضا میں — قیدی اک بے نام قضا میں
گھاس جو خاموشی سے نم تھی — خاک بسر پامال ستم تھی!
بُو جیسے بارُود کی بُو ہو! — کیچڑ میں انساں کا لہُو ہو!
سوئے ہوئے غاروں میں بگھیلے — اور ٹیلوں پر باز اکیلے
چیتے مست کچھاروں میں تھے — گیدڑ شب بیداروں میں تھے
کبھی کبھی جو ہانک لگا کر — ہنستے تھے پس خوردہ کھا کر
اور مسرور تھے سانپ اور اژدر — چودہ طبق تھے جن پر روشن
پلتے ہیں جو تاریک بنوں میں — کھل کھیلیں مضبوط تنوں میں!
کھا جاتے ہیں سالم، کچے — خرگوشوں ہرنوں کے بچے
یہ موسم تو عید تھا اُن کی — صدیوں سے اُمید تھا اُن کی
دُھندلے گھمن گھیر سمے میں — وقت کے اس اندھیر سمے میں
ڈاکو بھی اور چور بہت ہیں — چور مگر منہ زور بہت ہیں
سنّاٹوں کی اس دنیا میں — سفّاکوں کی اس دُنیا میں
دیکھا دھرم اور دین بھی اندھا — فطرت کا آئین بھی اندھا
اور انصاف بھی بہرہ دیکھا — ظلم کے رنگ کو گہرا دیکھا

کچلے ہوئے جذبات کو دیکھا
ہم نے جو جنگل رات کو دیکھا

(ایک تمثیل)

محمود رحیم

میں نئیں سب توں

چار جانب سے اندھیروں نے جو شبخوں مارے
تیرے چہرے کے اُجالوں نے سنبھالا ہے مجھے

جب بھی اُتری ہے کوئی رات جوارِ جاں میں
تیری آنکھوں کے چراغوں نے اُجالا ہے مجھے

جب بھی بھٹکا ہوں میں احساس کی ویرانی میں
تیرے لہجے کی بشارت نے نکالا ہے مجھے

جب بھی ڈوبا ہوں کسی ہجر کی طغیانی میں!
تیری قربت کے تصوّر نے اُچھالا ہے مجھے

خالد خواجہ
(کیلیفورنیا)

خالق نہ بنو

پتھر بھی کبھی ہنس پائے ہیں ؟
ہنسنا تو الگ اک آہٹ کی
اِن اندھوں سے اُمید نہیں
پھر ان کی رفاقت کیا معنی ؟

اِک عمر تراشو گے ان کو
ہر ضربتِ تیشہ کی آواز
احساس دلائے گی تم کو
تم پاگل ہو
پچھتاؤ گے
اور آخر اک دن تم اپنی
تخلیق سے ہی سر پھوڑ دو گے
مَر جاؤ گے

کہانی بدلتی ہے

ہرچرن چاولہ (ناروے)

افسانہ نگاری کے فن پر میں نے کوئی بیس سال سے زیادہ عرصہ تک ریاضت کیا ہے۔ اب مجھے گمان ہے کہ میری کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جو قاری کو پہلے لفظ سے لے کر آخری لفظ تک اپنی گرفت میں رکھ سکتی ہیں۔ اچھی کہانی کی اس سے اچھی دوسری تشریح میرے پاس نہیں ہے۔ میرے خیال کو تقویت تب ملی جب میری بیوی کی چینی دوست سن توئی سوئی اپنی کہانیوں کا پلندہ میرے پاس چھوڑ گئی، اور جب میں نے انھیں پڑھا تو مجھے بیس سال کی ریاضت کی محنت اور نئی کوشش میں زمین آسمان کا فرق نظر آیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ نئے لکھنے والے اچھی کہانیاں نہیں لکھ سکتے بلکہ کئی بار تو معاملہ بالکل ہی الٹا نظر آیا۔ مگر سن توئی کی کہانیوں کے بارے میں میں نے جو کچھ سوچا وہ مجھے بالکل ہی ٹھیک محسوس ہوا۔

سن توئی سوئی خود چینی شاہکار کی ایک خوبصورت کہانی ہو تو ہو مگر کہانی کار ہرگز نہیں۔ آپ اسے دیکھیں اور کہیں کہ وہ بھگوان کی لکھی ہوئی ایک خوبصورت نظم ہے تو شاید کوئی بھی آپ کی تشبیہ پر اعتراض کرنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔ توئی میری بیوی کی دوست ہے یہاں اوسلو سے نکلنے والے تارکینِ وطن کے ایک رسالے میں وہ چینی زبان کے سیکشن کی انچارج ہے اور میری بیوی ہندی سیکشن سنبھالتی ہے توئی کبھی کبھی میری بیوی کے ساتھ ہمارے گھر آ جاتی ہے۔ تو مجھے بھی غلط انداز نظروں سے دیکھ لیتی ہے۔ جب اسے پتہ چلا کہ میں افسانہ نگار ہوں اور اس نے میری ایک کہانی ناروے کے ایک بہت بڑے رسالے میں چھپی دیکھ لی تھیں۔ تو اس نے اپنی کہانیوں کا پلندہ میرے حوالے کر دیا۔ یوں اسے میرے نزدیک آنے کا بہانہ مل گیا۔

مجھے جو بات کہنی ہے وہ شروع سے آخر تک میرے ذہن میں میرے سامنے بچھی پڑی ہے۔ اس لئے اس کا اپنی کہانیوں کو میرے سپرد کرنا مجھے ایک بہانہ ہی لگا ورنہ اس کی کہانیاں ــ ان کے بارے میں وہ خود بھی اچھی طرح آگاہ ہے۔ اور میں تو اپنی رائے عرض کر ہی چکا ہوں۔ اس دن اس بہانے کو پاؤں بھی لگ گئے اور وہ چور دروازے سے میرے بہت قریب آ گیا۔ توئی نے ایک دن میرے دفتر میں مجھے فون کیا اور پوچھا۔ "آج شام کو کیا کر رہے ہو۔"

میں نے کہا۔ "گھر جا رہا ہوں۔"

اس نے آہستہ سے کہا۔ "ہندوستانی پتی دیو! گھر تو تم روز ہی جاتے ہو۔" پھر اونچی آواز سے بولی۔ "آج نہ جاؤ۔ یا ذرا دیر سے چلے جاؤ تو کیا فرق پڑے گا۔"

"بات کیا ہے؟" میں نے پوچھا اور ساتھ ہی دل ہی دل میں کہا۔ تم سندر سہی مگر میرے لئے اب ایزٹ اینڈ جوڑا گھر چشم زدن میں برباد کرنا مشکل ہے۔

"میں شام کو تمہارے دفتر پہنچ رہی ہوں"۔

میں چُپ رہا تو وہ بولی۔ "ہندوستان کی مہمان نوازی تو بہت مشہور ہے۔ کیا تم مجھے اپنے آپ کسی ریستورنٹ چلنے کی دعوت نہیں دے سکتے۔"

راہِ فرار مشکل پاکر میں نے کہا۔ پزاریا نیپولی، کیسا رہے گا۔؟ راہِ فرار کی بات تو خود اپنے ذہن کو سمجھانے کا بہانہ تھی۔ ورنہ میرے من کا چور اندر اندر بھنگڑا ناچ رہا تھا۔

"تمہارے ساتھ تو میں دوزخ میں بھی جانے کو تیار ہوں!" وہ آہستہ سے بولی۔ پھر اُونچی آواز میں کہا۔ "خوب بہت خوب! کہیں بھی لے چلو۔"

"تم یہ آہستہ آہستہ کیا کہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میرے ساتھ ایک سہیلی بیٹھی ہے۔ اُسے بڑبڑانے کی عادت ہے۔ تو آج شام میں پہنچ رہی ہوں!"

'پزاریا' میں میں نے اپنے لئے پزا مارکو رونی اور سیون اَپ کا انتخاب کرنے کے بعد مینو اس کی طرف بڑھا دیا۔ کچھ دیر مینو پر نظریں گھمانے کے بعد اس نے سپیگیٹیز پر انگلی رکھ دی۔ ریستورنٹ کیا تھا جیسے کوئی قلعہ ہو۔ جس میں کئی خانے اور کئی رستے ادھر اُدھر مڑتے تھے۔ چھپتے تھے اور پناہ دیتے تھے۔ مگر جسمانی پناہ کے باوجود کانوں کو سماعتی پناہ میسّر نہیں تھی۔ ہر طرف اتنا شور، سگرٹوں کا دھواں اور کھانے پینے کی چیزوں کی خوشبو۔ بکھری ہوتی تھیں کہ اس کی بات بمشکل مجھ تک پہنچ پاتی تھی۔ کھانے کے بعد اس نے بیرے کو بل لانے کے لئے کہا اور مجھ سے بولی:

"یہاں عاشق معشوق کو نہیں آنا چاہئے۔"

"عاشق معشوق؟" میں نے دہرایا تو وہ بولی۔

"تم بھی کسی کے عاشق ہو گئے اور میں بھی کسی کی معشوق ہوں۔ اب ہمیں اپنے اپنے عشق کی بات ایک دوسرے سے کرنی ہو تو بولو اس شور شرابے میں کیسے کریں۔"

میں نے وضاحت کے لئے اس کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگی۔ "تمہاری بیسیوں محبوبائیں ہیں کہانیاں۔ میرا ایک محبوب ہے الیفن سن۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے، کچھ سننا ہے۔"

"یہاں اتنے شور میں؟" میں نے پوچھا۔

"اسی لئے میں نے بل منگوا لیا ہے"۔ اس نے بل بیرے کے ہاتھ سے لیا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

بل ادا کرتے ہوئے میں نے سوچا جو عورت پیشگی وصول کرنے لگ جاتی ہے، اُسے آگے چل کر ضرور کچھ دینا ہوتا ہے مگر کیا میں سچ مچ کچھ وصول کرنے کی نیت رکھتا ہوں؟ خیر نیت چاہے کیسی بھی ہو کوئی عورت جو اتفاق سے خوبصورت بھی ہو اگر بل سامنے رکھ دے تو مرد کو خاموشی سے ادائیگی کر دینی چاہئے۔

باہر وارڈ روب سے کوٹ حاصل کر کے اسے پہنتے ہوئے میں نے پوچھا۔ "اب؟"

وہ بولی۔ "کسی لوؔلی پلیس (پُرسکون جگہ) پر چلیں۔" پھر مجھے سوچتے دیکھ کر بولی۔ "فراگز نیسٹرن کیسا رہے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" مجھے کہنا پڑا۔ دل میں میں نے سوچا۔ واہ ری چھوکری تو نے اوسلو کا سب سے اونچا لکڑی کا بنا کافی مہنگا ریسٹورنٹ چنا ہے۔

میری نیلی سترون میں جب وہ میرے سامنے بیٹھی تو میں نے کہا۔ "بیلٹ باندھ لو، کافی اونچائیاں اور موڑ ہیں۔"

"اور بیلٹ نہ باندھنے کا جرمانہ دو سو کرونے ہے۔" وہ بولی۔ "مگر مجھے بیلٹ کی کنڈی نہیں مل رہی ہے۔"

میں نہیں جانتا کہ کار بیلٹ کی کنڈی عورتوں کو سچ مچ نہیں ملتی یا جان بوجھ کر وہ اسے تلاش نہیں کرتیں کیونکہ ان کی سیٹ کی دائیں طرف کنڈی تلاش کرنے کے لئے آدمی کو ان کی دونو اونچائیوں سے بانہہ گزارنی پڑتی ہے۔ میرے ساتھ ایسا دوبار پہلے بھی ہو چکا ہے۔ مجبوراً میں نے عورتوں کو کار میں لفٹ دینی بند کر دی ہے۔ تب بھی میرے ساتھ یہی ہوا کہ کنڈی تلاش کرنے کو میری بانہہ کو اس کی دونوں پہاڑیوں سے گزرنا پڑا مگر کنڈی میرے ہاتھ نہیں آرہی تھی۔ آخر کافی کوشش کے بعد میں نے اسے اس کے دائیں کولہے کے نیچے دبا ڈھونڈ لیا۔ شکر ہے یہ ناروے ایسا ٹھنڈا ملک تھا۔ اگر برصغیر کا کوئی دیشی ہوتا تو میرا تمام خون ابل کر اور بہہ کر میرے ماتھے، گردن اور چہرے کا پسینہ بن جاتا۔

ریسٹورنٹ کے باہر کار پارک کرنے کے بعد پہلے تو وہ مجھے پہاڑی کے جنگلوں، جھاڑیوں اور پگڈنڈیوں پر گھماتی پھری۔ میں نے کہا۔

"کافی گھنا جنگل ہے۔"

وہ بولی۔ "وڈز کہو، جنگل ہوتا تو ہم تم گم ہو جاتے۔"

بہت دیر جنگلی راستوں پر گھومنے کے بعد جب ہمیں سردی لگنے لگی تو ہم ریسٹورنٹ کی طرف لوٹ آئے۔ دوسری منزل پر ہمیں کھڑکی کے بالکل پاس ایک خالی میز مل گئی۔ جہاں سے اوسلو روشنیوں کا شہر بنا بہت نیچے وادیوں میں ہمارے سامنے ایک جادوئی چادر کی طرح بچھا تھا۔ جس میں لاکھوں رنگ برنگے ستارے ہم سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اس نے نیچے بچھی خوبصورتیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کاش میرے ساتھ آج یہاں ایلفن سن ہوتا۔"

مجھے اس کا یہ کچوکا اپنی توہین محسوس ہوا مگر وہ کہتی گئی۔ "وہ حرام زادہ آج اس کمینی عورت کی باہنوں میں سر چھپائے پڑا ہوگا۔"

"کون عورت؟"

"ہے ایک! ایلفن سن کہتا ہے، تم اس سے مت جلا کرو۔ اس سے تو میں صرف تحریک حاصل کرتا ہوں، لکھنے لکھانے کی خون کی گرمی تو تم ہی سے ملتی ہے۔" انجول تم سچ بتاؤ۔ کیا میں صرف خون گرمانے کی بھٹی ہوں؟ کسی ادیب کی پریرنا نہیں ہو سکتی؟" وہ میری بیوی سے کچھ ہندی کے الفاظ بھی سیکھ رہی تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ باہر کی سردی سے آنے کے بعد اس کے گالوں کے انگارے دہک رہے تھے۔ ایک پل تو مجھے محسوس ہوا...... جیسے وہ واقعی گرم انگیٹھی ہے۔ جس پر ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھ سینکے جا سکتے ہیں۔ مگر اسے خوش کرنے کو مجھے کہنا پڑا

"تونی! تجھے دیکھ کر تو واقعی ذہن میں ہزاروں شعروں کی کھیتی رنگ برنگے پھولوں کی طرح لہلہانے لگتی ہے۔"

"ایلفن سن شعر نہیں کہتا۔ کورس کی کتابیں لکھتا ہے۔ میں تم سے پوچھتی ہوں۔ کیا الجبرا اور جیومیٹری لکھنے کے لئے بھی عورت کی گود میں سر رکھنا کافی ہے؟"

"بہتر ہے یہ تم اس سے پوچھو۔" میں اور کیا کہتا۔

"کئی بار پوچھا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ٹونی! دیکھو جب میں تمہارے پاس ہوتا ہوں تو خوابوں میں بھی اس کے پاس نہیں ہوتا اس لئے تم بھی اس کا ذکر مت کیا کرو۔"

"تم اسے چاہتی ہو؟"

"ہاں۔ مردوں سے بھری دنیا میں اگر کسی کو میں نے چاہا ہے تو وہ ایلفن سن ہی ہے۔ اُسی کے لئے میں نے ہانگ کانگ چھوڑا اور اتنی دُور چلی آئی۔"

"شہر سے یہ ریستورنٹ کتنی دُور ہے۔" میں نے یہ بول کر اسے جگانے کی کوشش کی۔" اور اس وقت تو تم میرے ساتھ ہو!"

اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ وہ بالکل خالی نظریں تھیں اور میرے لئے جاننا مشکل تھا کہ اسے میری بات کیسی لگی۔ ہندوستانی عورت ہنستی ہے تو کچھ جھینپتی ہے۔ یورپین عورت خوامخواہ ہی ہنستی ہے۔ مگر چینی خواہ مخواہ ہی نہیں۔ ہاں کسی نرالی بات پر اچھل کر آپ کی گود میں آ بیٹھے تو دوسری بات ہے۔ مثلاً آپ کی ناک پکوڑہ ہے۔ رنگ کالا سیاہ ہے۔ بال کاٹتے ہیں، تو شاید وہ آپ کو ماڈرن آرٹ کا کھردرا شاہکار سمجھ کر قریب سے دیکھنے کے لئے آپ کے بہت قریب آ جاتے۔ رات آپ کے ساتھ گزارے اور صبح 'بائی بائی ٹاٹا! تم کون ہم کون' مگر چینی لڑکی کو کیسے جانا جائے کہ اس کی کونسی ادا ہاں کہہ رہی ہے اور کونسی ناں۔ اس وقت اس کی نظروں سے مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا جیسے وہ ایسی مٹی ہے جس میں کس قسم کا بوٹا لگایا جائے جاننا مشکل ہے ـــ یہ جو سوچیں ہیں نامرد کے ذہن کو کتنی ہی راہیں دکھاتی ہیں۔ پہلے میرے اندر کے جس مرد نے اینٹ اینٹ جوڑ کے گھر کی فکر میں اسے نظرانداز کرنا چاہا تھا، اب ایک بلی کی طرح جھاڑیوں کی اوٹ چھپتا چھپاتا دبے پاؤں اپنے شکار کی طرف بڑھنے لگا تھا۔

"مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم ایک بے ضرر آدمی ہو۔" وہ بولی۔

"شکریہ! میں نہیں جانتا یہ تعریف ہے یا تنقید؟ مگر اس وقت تک ہمیں کچھ کھا بھی لینا چاہئے تھا۔"

"یہاں کے بیرے بڑے بے تکرے ہیں۔ شاید وہ تمہارے پیسے بچانا چاہتے ہیں۔ دیکھئے ادھر سے کسی کا گزر تک نہیں ہوا۔" وہ بولی

بہت دیر بعد ایک بیرا نظر آیا۔ تو میں نے اُسے بُلا کر ٹونی سے پوچھا۔ "تم کیا لوگی؟"

"صرف ایک کپ کافی!"

"این کوپ کافی۔ تھے اڈگ کاکے"۔ میں نے بیرے کو آرڈر دے دیا۔

واپسی جانے کے لئے کار میں بیٹھتے وقت مجھے پھر اس کے اردگرد بیلٹ باندھنی پڑی تو کنڈری کی تلاش میں میری باہنہ کو ڈبل اس کے گرد دائرہ بنانا پڑا۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ انگاروں کی تپش سے بچنے کے لئے میں نے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ "بہت خطرناک ڈرائیونگ ہے۔ یہاں بہت سے موڑ ہیں۔"

"زندگی میں کیا کم موڑ ہیں!" وہ بولی۔

کچھ دیر کی ڈرائیونگ کے بعد میں نے کہا۔ "سمیتا موڑ پر میں تمہیں اتار دوں تو چلی جاؤ گی ؟"

"کیوں دو قدم آگے نہیں آسکتے ؟ دیکھو میں تمہارے لئے کہاں تک آگئی ہوں ! اس کی خاموش آنکھوں نے کہا مگر زبان سے وہ صرف اتنا بولی۔" ونڈرن پاس ہی تو ہے"۔

ونڈرن اس کے گھر پہنچ کر جب میں لوٹنے لگا تو وہ بولی ۔"میری کہانیوں کے بارے میں تم نے کچھ نہیں بتایا۔ دو گھڑی بیٹھ چلتے تو ان کے بارے میں بات ہو جاتی۔" اور مجبوراً اس کے ساتھ اندر جانا پڑا۔

اتنا بڑا گھر اور وہ اکیلی ! میرے استفسار پر وہ بولی

" نارویجین مالک بزنس پر باہر گیا ہوا ہے اور اس کی بوڑھی بیوی اب اپنے کمرے میں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی ہوگی !"

اس کی کہانیوں کے بارے میں مُلائم ترین الفاظ میں میں نے اُسے جو کچھ کہنا تھا۔ کہہ دیا۔ مگر اس نے مجھ سے کہا:" ایک کہانی اور بھی ہے اور وہ یہ کہ میں..." اور اس نے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں کاغذ پر کچھ لکھ کر میرے سامنے رکھ دیا۔" میں انتقام میں بھی یقین رکھتی ہوں۔ اور اگر تمہیں یہ لفظ پسند نہ ہو تو مجھے 'نیوگ' پر بھی وشواش ہے۔ مجھے ایلفن سن سے ملے زمانہ ہو گیا ہے۔"

رات تین بجے جب میں اس کے گھر سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا کاغذ پر لکھی جانے والی کہانیوں کی نسبت ان کہانیوں کے پنجوں کی گرفت زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ جو ضمیر کے صاف سلیٹ کو سیاہ کر کے سفید چاک سے لکھی جاتی ہیں۔ اور ان کی کھُردری کہانی ہمیشہ اندر ہی اندر اپنے آپ کو پڑھتی رہتی ہے اور تو تی نے میرے ذہن پر میرے یورپ کے دس سال کے قیام میں پہلی بار ایسی کہانی لکھ دی ہے جو میں نے پہلے کبھی سوچی تھی نہ لکھی تھی۔


Ambassador
GAS AND ELECTRIC APPLIANCES
Gas Water Heaters
Gas Stoves
Water Coolers
Room Coolers
Gas Cooking Range
Freezers
Water Coolers
Room Coolers
Freezers
Water Coolers
Gas Stoves
Gas Cooking Ranges
Washing Machines
Gas Water Heaters
Elect. Water Heaters
Gas Room Heaters
MANUFACTURED BY
GAS AGE INDUSTRIES (PVT.) LIMITED
5-A, FAZAL ELAHI ROAD RAHMANPURA MORE
LAHORE-16 PAKISTAN PHONES 419883-411581

بچھڑ جانے کا موسم

شمس نغمان

میں اسلام آباد ایئرپورٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں اندرونی مین گیٹ جہاں سے سیکیورٹی کلیرنس ہوتی ہے کے عین سامنے بیٹھا ہوں اور لاؤنج میں داخل ہونے والے ہر شخص کو دیکھنے پر مجبور رہوں۔ ذاتی طور پر تاک جھانک کی اس مجبوری سے مجھے گھبراہٹ اور الجھن ہو رہی ہے۔ حالانکہ اس طلسم ہوش رُبا ماحول میں مجھے ذہنی آسودگی۔ راحت اور سکون محسوس ہونا چاہیئے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔

میں تذبذب کا شکار ہوں۔ اور شدید اضطراب میں گرفتار ہوں۔ وقت گزارنا میرے لئے مشکل ہو رہا ہے۔

ماورائی چہروں اور سحر انگیز روشنیوں کے اس کمرہ میں آٹھ بجے شب سے بیٹھا ہوں۔ میں پروٹوکول ڈیوٹی پر ہوں۔ میرے وزیر نے لاہور سے آٹھ بجے والی فلائٹ سے پہنچنا تھا۔ لیکن موسم کی خرابی کی وجہ سے فلائیٹ میں تاخیر ہو گئی۔ اب اعلان کے مطابق فلائٹ پونے دس بجے شب اسلام آباد پہنچے گی۔

اس فلائٹ میں میرے وزیر کے علاوہ ایک دو وفاقی وزیر دو وفاقی سیکرٹری، ایک دو صوبائی سیکرٹری اور کچھ ایم این اے حضرات بھی آ رہے ہیں، ان سب صاحبان کے پروٹوکول آفیسرز لاؤنج میں پریشانی اور سراسیمگی کی حالت میں اِدھر اُدھر بھاگم بھاگ میں کوئی نصف پون گھنٹہ تک مصروف رہے وہ دراصل جاننا چاہتے تھے کہ لاہور میں موسم کیوں اور کب خراب ہوا۔ کب اور کس طرح موسم کا مزاج شد ھرے گا۔ یہ سب کچھ جاننے کے لئے ان کی یہ غیر معمولی پریشانی نے استقبالیہ کے آفیسران اور عملہ کو بھی پریشان کر رکھا تھا۔ کئی بار وہ اپنے اپنے صاحبوں کے گھر بیگمات کو مطلع کر چکے تھے کہ جہاز لاہور سے ابھی روانہ نہیں ہوا۔ کئی بار وہ اپنے اپنے گھر اپنی اپنی بیویوں کو بھی یقین دلا چکے تھے کہ وہ اس وقت کہیں اور نہیں وی آئی پی لاؤنج میں ہی پائے جا رہے ہیں۔ بہر حال ان میں سے کچھ جا چکے ہیں۔ کچھ تھک ہار کر اِدھر اُدھر صوفوں میں بیٹھ گئے ہیں۔

لاؤنج میں کچھ دیر کے لئے سکون سا ہو گیا ہے۔

میں اپنے گھر اس لئے نہیں جا سکتا کہ میرا گھر شہر کے گنجان آباد محلہ کی ایک گلی میں واقع ہے۔ دوسرے مجھے مری روڈ بھی پار کرنی پڑتی ہے۔ جہاں ٹریفک کا ایک بے ہنگم سیلاب چوبیس گھنٹوں میں سے کم از کم بیس گھنٹوں تک جاری رہتا ہے اور سڑک دن بہ دن سکڑ رہی ہے جبکہ غیر قانونی ملکیت اور ناجائز پارکنگ پھیل رہی ہے۔

لہٰذا اگر میں گھر جاتا ہوں (ویسے بھی جب کسی وی آئی پی نے آنا ہوتا ہے تو میرا تعلق عارضی طور پر گھر سے منقطع ہو جاتا ہے)

تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں واپس وقت پر پہنچ نہ پاؤں اور جہاز آجائے۔

ایسی صورت میں کہ اگر جہاز آچکا ہو۔ پروٹوکول آفیسر موجود نہ ہو تو اس بے چارے پر ٹوٹنے والی قیامت؟ اب میں دیکھنا پسند بھی نہیں کرتا۔ جہاز خواہ ساری رات نہ آئے میں اس وقت تک یہاں بیٹھا رہوں گا۔ جب تک حتمی طور پر اس فلائٹ کی منسوخی کا اعلان نہیں ہو جاتا۔

یہ پروٹوکول ڈیوٹی ہے۔ پروٹوکول ڈیوٹی بھی اک داستان ہے۔ جس میں ہزاروں کہانیاں ہیں۔ اور داستانیں موجود ہیں، ہونی اور انہونی باتوں، پھولوں سے مہکتے لمحات اور قیامت سے بھی قیامت خیز واقعات منسوب ہیں۔ اس عجب داستان کے ساتھ۔

کچھ دیر بعد اس لاؤنج میں اچانک رونقیں دوبارہ بڑھنے لگی ہیں۔ کراچی جانے والی ۹-۳۰ کی فلائٹ اناؤنس ہو گئی ہے۔ وی آئی پی آرہے ہیں اور اس لاؤنج میں اک دلچسپ اور عجب بات یہ بھی ہے کہ پروٹوکول آفیسرز کو ہر وی آئی پی کے لئے اُٹھ کر کھڑا نہیں ہونا پڑتا۔ اور نہ ہی مغلیہ دَور کی غلام گردشوں والے سلام بجالانے پڑتے ہیں۔

یہ واقعی اس کی اپنی پسند اور ناپسند ہے۔ کہ وہ کس وی آئی پی کی کس قدر تعظیم کرتا ہے۔ بعض اوقات ایسے بھی ہوتا ہے کہ وہ شخصیت جسے دیکھنے یا ملنے کے لئے مہینوں سڑکوں۔ راہداریوں میں کھڑا ہونا پڑتا ہے اور پھر بھی اس کے دیدار یا ملاقات نہیں ہو پاتی۔ اس طلسم ہوش رُبا اور ماورائی کمرہ میں آپ چاہیں تو اس کی جانب نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ کوئی آسمان کسی پر بھی نہیں گرے گا۔

اب میرے سامنے والے دروازہ میں اچانک ایک سابق وزیر اعظم کالی قراقلی ٹوپی۔ سفید شلوار قمیص اور کالی واسکٹ پہنے سیکورٹی چینل پر نمودار ہوتے ہیں۔ سیکورٹی کا عملہ احتراماً بس واجبی سی سیکورٹی چیکنگ کرتا ہے۔ ان کی روایتی مسکراہٹ جب وہ وزیر اعظم تھے اور جب وہ وزیر اعظم نہیں ہیں، اب بھی قائم ہے وہ میری دائیں جانب صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں احتراماً ان کے پاس جاتا ہوں۔ ان سے ہاتھ ملاتا ہوں۔

"آپ ٹھیک ہیں!" وہ مسکراتے ہوئے پوچھتے ہیں۔ ان کے انداز میں بے پناہ اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ میری ان سے پہلی ملاقات ہے۔ میں واپس اپنی جگہ پر آن بیٹھتا ہوں۔ اور وہ اخبار کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

دوبارہ اعلان ہوتا ہے کہ لاہور سے آنے والی فلائٹ اب پونے دس بجے کی بجائے گیارہ بجے پہنچے گی۔ لاؤنج کی چھت پر لٹکنے والا فانوس جیسے ٹوٹ کر میرے سر پر آن گرا ہو ——!

میں سخت کوفت زدہ ہو کر جھنجھلاہٹ اور کرب کی ملی جُلی کیفیت میں اپنی جگہ سے اُٹھتا ہوں۔ سنیک کاؤنٹر پر رکھے ٹھنڈے یخ پانی کے دو گلاس اپنے حلق میں انڈیلتا ہوں۔ گھر اپنی بیوی کو فون کرتا ہوں۔ میری بیٹی بتلاتی ہے کہ امّی سوئی ہوئی ہے۔ بلکہ سب گھر والے سو چکے ہیں ماسوائے اس کے۔ میں اسے بھی سو جانے کی تلقین کرتا ہوں۔ اور فون بند کر دیتا ہوں۔ اب ایپرن کی جانب منہ کر کے بیٹھ جاتا ہوں اور شیشوں کے باہر پھیلی تیز زرد روشنیوں میں کھڑے جہازوں کو دیکھنے لگتا ہوں۔ قدرے سُکھ کا سانس نہ جانے کونسی نس سے اُٹھتا ہے۔ اس کے باوجود مجھے اپنا آپ بوجھل بوجھل

محسوس ہونے لگتا ہے۔

دفعتاً مجھے خیال آتا ہے کہ میں سابق وزیر اعظم کے آٹوگراف ہی لے لوں۔ تاکہ میرا بیٹا اپنے سکول میں اپنی حیثیت کا گراف ذرا اونچا کر لے۔

میں اپنی واسکٹ کی جیب میں ہمیشہ ایک آٹوگراف بک رکھتا ہوں ___ اس لاؤنج میں جب بھی کسی وی وی آئی پی قسم کی شخصیت سے ملاقات ہوتی ہے۔ میں اپنے بیٹے کامران کے لئے آٹوگراف لے لیتا ہوں۔ اس طرح اس کے سکول میں اس کی حیثیت کا گراف اونچا ہوتا رہتا ہے۔

میں جلدی سے اپنے واسکٹ کے اندر والی جیب سے آٹوگراف بک نکالتا ہوں۔ لیکن یہ چھوٹی سی رنگ برنگے اوراق والی آٹوگراف بک کامی کی آٹوگراف بک نہیں ہے یہ تو کئی برس پرانی بک ہے۔ کئی سال پرانی جس کے ایک زرد رنگ کے صفحہ پر سلمٰی مراد نے لکھا تھا۔

"میرے اور تمہارے بچھڑ جانے کا موسم آ گیا ہے۔

تمہارے ساتھ گزرے ہوئے تمام لمحات۔ ان لمحات کے لمس اور ذائقوں کو ایک پوٹلی میں باندھ کر لئے جا رہی ہوں!

اگر تم محبت کی ان امانتوں میں سے کوئی امانت واپس لینا چاہو تو میرے پاس چلے آنا۔ میرے دل اور گھر کے سارے دروازے ہر وقت اور ہر موسم میں کھلے رہیں گے۔ تم بلا جھجک بغیر دستک دیئے کسی بھی دروازے سے اندر چلے آنا! تب ہم دونوں امانتوں کی اس پوٹلی کو کھولیں گے۔ تم اپنی پسند کی یاد واپس لے جانا

تمہاری اور صرف تمہاری

سلمٰی مراد

زرد رنگ کے اسی صفحہ کو آج سے چند سال پہلے ملک علی مراد کا چھو کے مہمان خانے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ شاید آموں کے پکنے کے آخری دنوں کا موسم تھا۔

ملک علی مراد کا چھو کے آموں کا باغ چھ سات ایکڑ کے رقبہ میں پھیلا ہوا تھا۔ تمام رقبہ کے گرد تین چار فٹ اونچی اور ایک دو فٹ چوڑی کچی دیوار چنی دی گئی تھی۔ جو حد بندی کا کام بھی دیتی تھی۔ اسی دیوار کے ساتھ ساتھ کھجوروں کے درخت لگا دیئے گئے تھے۔ بقول مالی چراغ دین ملک علی مراد کا باپ ملک جہانگیر مراد بصرہ سے ان کے بیج لایا تھا۔ کھجور کے درخت اب آسمان سے باتیں کرتے تھے اور ان کی چھتریاں ہواؤں پریوں کی مانند رقصاں رہتی ہیں۔ جن کی سرسراہٹ سے اک عجیب سحر انگیز ماحول ساری فضا کو اپنے حصار میں لئے رہتا ہے۔

صبح جب میں شجاع آباد کے سٹیشن پر اترنے کے بعد ایک پرائیویٹ ٹیکسی کار میں بیٹھا تو اس کے ڈرائیور نے مجھے مہمان خانے تک پہنچانے کے پیسے نہیں لئے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ مالکوں کی حویلی میں آنے والے مہمانوں سے کرایہ نہیں لیا جاتا۔ بس صرف چوکیدار کو بڑے پھاٹک پہ کار کا نمبر اور تاریخ لکھا دی جاتی ہے۔ مہینے کے مہینے ہر بندے کا حساب کتاب منشی مہتاب خان بڑی باقاعدگی سے کر دیتا ہے اور آموں کے موسم میں ایک ایک پیٹی آم بھی ڈرائیوروں کو مل جاتی ہے۔

(یہ بات سلمٰی مراد نے مجھے پہلے ہی بتلا رکھی تھی)

مجھے جس کمرہ میں ٹھہرایا گیا تھا۔ اس کی دیواریں سُرخ مٹی کی بنی ہوئی تھیں بلکہ سارے کا سارا مہمان خانہ ہی سُرخ گیرو مٹی کا بنا ہوا تھا۔ گرمی کی شدت کتنی بھی ہو اس مہمان خانے کے تمام کمرے ٹھنڈے رہتے ہیں۔ کمرہ میں آرام و آسائش کی تمام اشیاء انتہائی قیمتی تھیں اور بڑے قرینے سے سجائی گئی تھیں۔ کمرے کی عقبی دیوار میں ایک بڑی کھڑکی تھی جس میں نہایت اعلیٰ درجہ کی خس کی جالی لگی ہوئی تھی اور ایک ملازم ہر دو تین گھنٹوں کے بعد اس پر پانی چھڑکانے پر مامور تھا۔ منشی مہتاب خان نے بتلایا کہ اس کے علاوہ بھی تین اور مہمان خانے ہیں جن میں سے ایک گرین ہاؤس کہلاتا ہے جو کہ صرف وی آئی پی ٹائپ کے مہمانوں کے لئے وقف ہے مجھے بتلایا گیا کہ کھانا مہمانوں کو ان کی اپنی پسند کے مطابق ان کے کمروں میں ہی پہنچا دیا جاتا ہے۔

ان مہمان خانوں سے الگ تھلگ باغ کے جنوبی حصہ میں ملک علی مراد کاچھو کی سات آٹھ کنال کے رقبہ میں پھیلی ہوئی حویلی تھی۔ حویلی کے بارے میں مشہور تھا کہ اس میں پرندوں کا دودھ نہیں باقی سب کچھ موجود ہے سلمیٰ مراد نے یہ بھی بتلایا تھا کہ اس حویلی کے اندر کا سارا ماحول الف لیلوی تھا۔

آٹوگراف بک کا زرد رنگ کا صفحہ میں بار بار حرف حرف۔ لفظ لفظ۔ سطر سطر پڑھ رہا ہوں۔ خس کی جالی سے گزر کر کمرہ میں آنے والی خوشبو کی مہک سے میرا سارا وجود نشیلا نشیلا سا ہو رہا تھا۔ میری آمد کی اطلاع لے کر ملازم حویلی میں جا چکا تھا۔ میں سلیمان مراد کا منتظر ہوں۔ اس لئے کہ سلمیٰ مراد نے مجھے یہ بھی بتلایا تھا کہ جب کبھی بھی میں اس سے ملنے آؤں تو اس کے چھوٹے بھائی سلیمان مراد سے ملاقات کرنے کے لئے کہوں کیوں کہ ان کی حویلی میں کسی غیر مرد کا کسی بھی خاتون خانہ کا نام لینا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اور اس گناہ کی سزا کا تعین صرف علی مراد کاچھو ہی کرتا ہے۔

مجھے اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا کہ کب کوئی ملازم میرے لئے شربت صندل جس میں چاندی کے ورق اور بادام کی گریاں تیر رہی تھیں چاندی کی طشتری میں رکھ کر چلا گیا تھا۔

میں گلاس میں سے گھونٹ گھونٹ شربت پی رہا ہوں جس سے حلق میں جل اُٹھنے والے کانٹوں کی آگ تو ٹھنڈی ہو رہی ہے لیکن دل کی آبادی میں لگی ہوئی آگ خوشبودار خس کی جالی کو پار کر کے اندر آنے والی ہوا سے اور بھڑک رہی تھی۔

دل کی اس آبادی میں کہیں کہیں خوف اور وسوسوں کے جھٹکے بھی محسوس ہو رہے ہیں اور کبھی کبھی مجھے یہ احساس بھی چبھ رہا ہے۔

"مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا!"

اچانک مجھے یاد آتا ہے کہ یونیورسٹی کے آخری دن باتوں باتوں میں سلمیٰ مراد نے مجھے یہ تاکید بھی کی تھی کہ میں اگر کبھی اس کی حویلی میں آؤں تو سلیمان مراد یا پھر منشی مہتاب خان سے بھول کر بھی اس بات کا ذکر نہ کروں کہ میرا باپ ریلوے میں اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ہے اور میری چھ بہنیں ہیں جن کی شادیاں بھی ہونی ہیں۔ دو چھوٹے بھائی اور السر کی مریضہ ماں بھی ہے۔

"مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا!"

میں اپنا وجود واپس لینے آیا ہوں۔ یا پھر کوئی ایک یاد۔ کوئی ایک واقعہ پیار کی امانتوں کی پوٹلی میں سے حاصل کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ کہ جس کے سہارے باقی ماندہ زندگی کے عذابوں سے بچ سکوں۔۔

شیشے کے گلاس میں صندل کا شربت اب ختم ہو چکا ہے!

میرے کان سلمیٰ مراد کے قدموں کی چاپ سننے کے لئے بے تاب ہیں۔ سلمیٰ مراد کے قدموں کی چاپ جیسے جھرنوں کا پانی پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر کسی ندی میں گر رہا ہو۔ قدموں کی چاپ کہ جیسے ۔۔

کمرے کی فضا میں بھاری بھرکم پتھر پہاڑ سے اچانک لڑھک جائیں۔ میں چونک اٹھتا ہوں میرے سامنے ایک درمیانہ قد اور سانولی رنگت کا پتلا دبلا نوجوان کھڑا ہے اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک ہے۔

"میں سلیمان مراد ہوں اور آپ شاید اعظم نثار"

میں احتراماً کھڑا ہو چکا ہوں وہ آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کرتا ہے۔ اس کے مصافحہ کرنے کے انداز میں سرد مہری کا سا احساس نمایاں ہے۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھ جانے کو کہتا ہے۔ میری جانب بڑے غور سے دیکھتے ہوئے ماحول میں یکدم چھا جانے والی خاموشی کو توڑتا ہے۔

"باجی نے ایک دو دفعہ ذکر کیا تھا۔ آپ کا۔ لیکن آپ یوں اچانک چلے آئیں گے۔ یہ بات باعث حیرت ہے۔" اس کے لہجے میں بڑا روکھا پن ہے میں خاموش رہتا ہوں۔

"بہرحال اب آپ آ ہی گئے ہیں تو خوش آمدید دراصل حویلی میں بابا سائیں کے کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں اس لئے مجھے اور میرے بڑے بھائی سلطان مراد کو کھانا اُن کے ساتھ ہی کھانا پڑ رہا ہے۔

"جی ۔۔!" جیسے میں کھجور کے درخت کی چھتری کے ساتھ اُلٹا لٹکا ہوا ہوں۔ اور میری آواز نیچے کنویں میں گر رہی ہے۔

"آپ دوپہر کا کھانا کھائیں۔ کچھ دیر آرام کریں پھر ہمارا منشی آپ کو ہمارے باغ کی سیر کروائے گا۔ اور نئے فش فارم پر بھی لے جائے گا۔ جہاں پر چلنے کے ساتھ ساتھ آپ کی تواضع تلی ہوئی سائمن اور بلیک رہو مچھلی سے کی جائے گی۔

اس کے بعد وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور منشی مہتاب خان کو مہمانداری پر مامور کر کے کمرے سے باہر جانے لگا تو میں نے اپنی تمام حسیات کو یکجا کر کے پوچھ ہی لیا۔"

میرا خیال ہے سلمیٰ مراد صاحبہ کو میرے یہاں آنے کا علم نہیں ہو سکا۔"

وہ پلٹا ۔ میری جانب غور سے دیکھا۔ مسکرایا اور پھر بڑے دھیمے انداز میں بولا۔

"آپ کا خیال درست ہے۔ انھیں آپ کے آنے کی اطلاع مل گئی تھی۔ تبھی تو میں یہاں حاضر ہوں۔ ویسے ہم عام مہمانوں سے ملا نہیں کرتے۔ ان کے لئے ہمارے منشی منشی ہی کافی ہیں۔

یکدم جیسے کمرے کے اندر سورج اُتر آیا ہو۔ میرے بدن کا رواں رواں جلنے لگا۔ بوٹی بوٹی پگھلنے لگی۔

اور ہاں یاد آیا۔ اگر آپ نے رات قیام کرنا ہو تو مہتاب خان کو بتلا دیجئے گا۔"

رات کو آپ کی بوریت دُور کرنے کے لئے یہ وی سی آر، کچھ انگریزی اردو وڈیو فلمیں ۔ اور رنگین ٹی وی کا یہاں پر انتظام کر دے گا۔"

ایسے لگ رہا تھا کہ اس کے اندر کہیں کوئی شے اُبل رہی تھی۔ جسے وہ کمال جُرأت اور ہمت سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔!

"اور ہاں اگر آپ نے شام تک واپس جانا ہو تو ہمارا ڈرائیور آپ کو شجاع آباد سٹیشن تک چھوڑ آئے گا۔ یہاں سے شام چھ بجے پسنجر ٹرین ملتان کے لئے چلتی ہے!"

یوں بھی ہو سکتا تھا کہ کمرے میں اُترا ہوا سورج میرے بدن کے اندر میرے گوشت اور ہڈیوں کو پگھلا کر کھرے میری سانسیں تک جل جائیں۔ میں نے اپنے بریف کیس سے ایک پیکٹ نکالا اور سلمان مراد کی جانب بڑھا دیا۔

"یہ ایک ساڑھی ہے جو میں سلمیٰ مراد صاحبہ کے ایم اے میں پاس ہونے کی خوشی میں تحفتاً لایا تھا۔"

اُس نے منشی صاحب کو آواز دی۔

"مہتاب سائیں یہ پیکٹ لے لو اور باجی کو پہنچا دو!"

کمرے میں اُترا ہوا سورج خس لگی کھڑکی کے راستے باہر جا چکا تھا۔ سلمان مراد اور منشی مہتاب بھی کمرے میں موجود نہیں تھے۔ اس سے پہلے کہ میرا وجود گیر دی رنگ کی دیواروں میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا۔ میں وہاں سے بھاگ آیا تھا۔ میرے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی آٹوگراف بک ابھی تک کھلی ہوئی تھی۔ ماضی کے سارے فریم جو اس کے زرد رنگ کے صفحہ پر اُبھرے تھے اب دھندلے ہو کر مٹتے جا رہے تھے۔ میری آنکھوں کی پتلیوں پہ گدلے گدلے پانی کی تہیں چڑھتی آ رہی تھیں اک انجانا خوف میرے سارے وجود میں پھیل جاتا ہے۔!

میں اپنی آنکھوں کی پتلیوں پر پھیلے ہوئے گدلے پانی کو صاف کرتے ہوئے آٹوگراف بک بند کر دیتا ہوں۔

"یہ تم بائیبل پڑھ رہے تھے" اک شخص نہ جانے کب سے میرے قریب آن بیٹھا تھا مجھے بڑا شناسا سا لگتا ہے۔

"اوئے تو انظم نثار ہی ہے نا" کھڑے کھڑے کانوں۔ لمبی سی ناک والا۔ ایک سیاہ چہرہ۔!

"اوئے۔ جنید۔ تو!" ہم دونوں ایک دوسرے سے باقاعدہ اُٹھ کر گلے ملتے ہیں۔

"OH YES NISAR" ۔ ہیں۔ جنید اقبال۔ اوئے تو تو بالکل بڈھا ہو گیا ہے۔ تیری تو ساری شکل ہی بدل گئی ہے بڈھے گیدڑ کی طرح۔ سُنا اِدھر کدھر۔"

"تو اِدھر کدھر۔ یار تو ذرا بھی نہیں بدلا۔ ویسے کے ویسے ہی ہے۔ بس ذرا موٹا موٹا سا ہو گیا ہے۔ بالکل اُودھ بلاؤ کی طرح۔!"

"کتنے سالوں بعد ملے ہیں۔"

"یہی کچھ بیس اکیس سال بعد"

"شکر ہے تو مر ہی نہیں گیا۔ کبھی کبھی تو بہت یاد آتا تھا۔ کیا کرتا ہے آجکل۔"

"زندگی ضائع کر چکا ہوں۔ بس اپنے آپ کو گھسیٹ گھساٹ کر ڈپٹی ڈائریکٹری تک پہنچا ہوں۔ اور تو" میں ذرا سنجیدہ سا ہو جاتا ہوں۔

"میں نے سی ایس پی کر لیا تھا۔ ڈپٹی کمشنری بھی کی۔ کمشنر بھی رہا، اب ڈپلومیٹک مشن کے لئے کیوٗ میں ہوں۔"

اتنے میں لاہور کی فلائیٹ کی آمد اناؤنس ہو جاتی ہے۔ ہم دونوں صوفے پر سے اُٹھتے ہیں۔ ابھی تک اُس نے میرا ہاتھ

بڑی گرمجوشی سے تھاما ہوا تھا۔ "ادھر کدھر آئے ہو؟" وہ پوچھتا ہے۔
"میرے وزیر صاحب اور اُن کی فیملی آ رہی ہے۔ میں پروٹوکول پر ہوں۔"

اَب ہم آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے اُس دروازے کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں جہاں سے آنے والے اس لاؤنج کے اندر داخل ہوتے ہیں۔

تب اچانک ایک بڑی معصوم سی بچی جس نے سُرخ رنگ کی شرٹ اور بلیو جینز پہنی ہوئی ہے۔ جنید کی طرف بڑھتی ہے اور والہانہ انداز میں اس سے لپٹ جاتی ہے۔

وہ اسے میرے پاس لے آتا ہے۔ "بیٹی ان سے ملو۔ تمہارے انکل۔"

میں اُس بچی سے ہاتھ ملاتا ہوں۔ نرم ملائم اور شفاف ہاتھ۔ تب نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ میں اُس بچی کی آنکھوں میں جھانکتا ہوں۔ اس کی گہری بنفشئی رنگ کی آنکھوں میں ایک شبیہہ اُبھرتی ہے۔

"نثار۔ یہ میری بیٹی سُندس مُراد۔ میری اور سلمیٰ مُراد کی اکلوتی بیٹی۔!

یکدم مجھے ایسے لگتا ہے کہ گہرے سیاہ بادلوں کے بیچ کوئی بادل آپس میں ٹکرا گئے ہوں۔ لمحہ بھر کے لئے میرے وجود کے اندر پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد بس مجھے اتنا یاد ہے کہ میرے منسٹر صاحب کا بھاری بھرکم بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ اور ان کی بیگم اور بچے آگے آگے جا رہے تھے۔ میرے دوسرے ہاتھ کی اُنگلی چھوٹی سی بچّی نے تھام رکھی تھی۔!

لیکن میں اپنے وجود سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ اور وہیں ساکت و جامد کھڑا تھا۔ جہاں ابھی چند لمحے پہلے مجھے سُندس مُراد ملی تھی۔!

وَن ٹُو تھِری

آئینہ عنبرین

وہ کم بخت شکل سے تو بالکل حبشن لگتی۔ آبنوسی رنگ، چپٹی ناک، سیاہ موٹے موٹے ہونٹ اور چمکدار سفید دانت، حالانکہ اُسے کبھی بھول کر بھی انھیں صاف کرنے کا خیال نہیں آیا ہو گا۔ پھر بھی اتنے شفاف موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے نجانے کیسے؟ اکثر حیران ہوتی لیکن اس حیرت کے اظہار کا موقع شاذ ہی کبھی آتا۔ ورنہ میں اُس کی باتوں میں اس طرح گم رہتی جیسے ... جیسے ... حالانکہ اس کا بھی کوئی جواز نہ تھا۔ میرے اور اُس کے سن میں زمین آسمان کا تو نہیں کم از کم زمین اور کوٹھے کا فرق ضرور تھا۔ تبھی تو بقول اس کی ماں کے "حرامجادی کوٹھے کا کوٹھا ہو گئی پر شرم نام کو نہیں۔"

سولہ سترہ سال کی یہ لڑکی جو ہر وقت اتنی غلیظ رہتی کہ نزدیک سے گزرتے ابکائی آجائے۔ اُس کا ہاتھ چوبیس میں سے ساڑھے تیئیس گھنٹے جوؤں اٹا سر کھجاتے گزرتے ہوں گے۔ نجانے مجھے کیوں اتنی اچھی لگتی کہ سکول سے آنے کے بعد اسی کی جُدائی کا ایک گھنٹہ بھی مجھ پر بھاری گزرتا۔ ہزار بار پٹ چکی، جُوتے کھائے، کوسنے لئے۔ بدذات تجھے اس غلیظ بھنگن کی لڑکی سے کھیلنے کے سوا اور کوئی نہیں ملتا۔ ایک تو جمعدارنی اُوپر سے گندی بھی اتنی۔ جتنی عام طور پر بھنگنیں بھی نہیں ہوتیں۔ وہ بھی کام کاج سے فارغ ہو کر منہ ہاتھ دھو ہی لیتی ہوں گی " میرے والدین اکثر یہ کہتے سُنے جاتے۔ یہ بھئی مالک اور نوکر ادنیٰ و اعلیٰ کا خیال تھوڑا بہت تو رکھنا ہی پڑتا ہے نا؛ ان کے لئے اس سے بڑا چیلنج کیا ہو گا کہ اُن کی تیتریوں جیسے رنگ برنگے دُھلے دُھلائے فراک پہننے والی پیاری سی آٹھ نو سالہ بچی اس غلیظ بھنگن کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے دیکھی جائے۔ میرے اَبّو مجھے کم اور اُسے زیادہ ڈانٹتے۔ " او بشیراں کی بچّی! خبردار اب جو تونے بچّی کو بلایا ہو یا ادھر کا رُخ کیا جان سے مار دوں گا۔ تیرا اس کا کیا ساتھ اپنی عمر دیکھو اور اپنا حلیہ دیکھو..." اُدھر جب کبھی بھی بشیراں کے سر سے میرے سر تک سفر کرنیوالی جوؤں کا میری امی کو قلع قمع کرنے کی مہم سر کرنی پڑتی تو وہ الجھ اُلجھ پڑتیں، اور مجھے طرح طرح سے ڈرائیں دھمکاتیں کہ اب کے تمہیں جوئیں چڑھیں تو تیرا سر منڈوا کر چھوڑوں گی۔ بلکہ سر کاٹ ہی دوں تو اچھا ہے نہ ہو گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ یہ بانسری تو بس بجے ہی نہ بجے۔ سر میں بشیراں کا سودا اور دل میں اُس کی یاد لئے تاک جھانک میں مصروف کبھی کسی باڑ کی اوٹ سے اُس کی کھوج اور کبھی مہرونٹ کوارٹر میں اس کی تلاش اور کبھی چھت پر چڑھ کر اُسے اشاروں سے بلایا جاتا۔ جب اُس کا آنا ناممکن نظر آتا تو میرا ہر چیز سے دل اچاٹ

ہو جانا، کھلونے زہر لگنے لگتے۔ کھانا پینا اچھا نہ لگتا۔ یہ سارے انداز اب جا کے جانا کہ عشق کے ہوتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ مجھے اُن دنوں واقعی بشیراں سے عشق ہی تو تھا۔ اُس سے نہ سہی، اس کی باتوں سے جن میں طرح طرح کے انکشافات ہوتے مجھے حیران کر دینے والے، چونکا دینے والے، رنگ برنگی شرارے چھوڑتے پھلجھڑیوں کی مانند، لیکن یہ رنگ برنگی پھلجھڑیاں دیکھنے کے لئے مجھے گھر سے بہت ڈانٹ برداشت کرنا پڑتی۔

جب ابّو کے کہنے پر اُس کا گھر میں اور لان کی حدود میں داخلہ ممنوع ہو گیا تو میں نے کسی بے بس بے قرار عاشق کی طرح اُسے مل کر مشورہ دیا کہ تم اپنی ماں کے بجائے ہمارے گھر کام کرنے آجایا کرو نا! ہٹی کٹی تو ہو"۔ یوں دن میں دو مرتبہ جھاڑو پونچھے کے بہانے اُس کی ملاقاتوں کا در کھل جاتا ۔۔ یہ ذہانت چند روز تو کام آگئی اور مجھے بشیراں کا دیدار نصیب اور اُس کی باتوں کا امرت میسّر آتا رہا۔ لیکن ادھر میرا عشق اور اُدھر اس کے جسم کی "مشک" ان میں سے تو کوئی ایک چیز بھی چھپائے نہیں چھپتی۔ یہاں تو پھر دونوں ہی موجود تھیں۔ نتیجہ یہ کہ گھر والوں کو پھر ہماری خفیہ ملاقاتوں کا علم ہو گیا۔ میری پٹائی ہو گئی اور بشیراں کو کام فی الفور اپنی ماں کے سپرد کر دینے کا حکم ملا۔ اس کی شکایت اسی کے باپ سے کی گئی جس نے جھاڑو سے اُسے خوب جھاڑا۔ میرے ابّا امی سے کہتے سُنے گئے۔ نجانے کیا نفسیاتی پرابلم ہو گیا ہے۔ اس بچّی کو ؟ کچھ سمجھ نہیں آتا کیا انٹرسٹ ہے اس کا ؟ پھر مجھے بہت سی چیزیں اور کھلونے دینے کا وعدہ دے کر پوچھا گیا کہ اچھا بیٹی، بتاؤ تو بھلا۔ تم اتنی گندی لڑکی کے ساتھ کیوں کھیلتی ہو ؟ وہ تمہیں کیوں اچھی لگتی ہے۔ میرا دل تو چاہا کہ پھٹ کر کہہ دوں کہ بشیراں مجھے اتنی مزیدار باتیں سناتی ہے کہ کوئی بھی نہیں سُنا سکتا۔ اب تو جنوں اور پریوں کی کہانیاں بھی اچھی نہیں لگتیں۔ آپ جھوٹی جھوٹی باتیں بتاتے ہیں کہ بچے اللہ میاں فرشتوں کے ہاتھ چھت میں سوراخ کر کے بھجوا دیتے ہیں۔ مجھے پتہ لگ گیا ہے ایسے نہیں ہوتا چل گیا ہے بس چل گیا ہے"۔ لیکن میں کچھ بول نہ پائی ۔۔ یوں لگا جیسے گلے میں ریت پھنس گئی ہو۔

مگر اس واقعے کے بعد مجھے بشیراں نے محتاط رہنے کا مشورہ دیا کہ میں اس سے ملنے کی بے قراری کا اظہار نہ کیا کروں اور اسکول سے واپس پر تانگے سے اُترتے ہوئے جان بوجھ کر تختی یا دوات گرا دیا کروں۔ جسے دوڑ کر پکڑانے کے حیلے سرگوشی میں وقت اور ملاقات کی جگہ مقرر کر لی جائے۔

خدا خدا کر کے سردیاں گزریں، بہار آئی۔ ہمارے لان میں اتنے بے شمار پھول کھلے جن پر ہر وقت تتلیاں منڈلاتی رہتیں۔ دور تک کھیتوں میں سبزہ ہی سبزہ تھا۔ لیکن اب کی بار نہ میں نے کتابوں میں پھول پریس کئے اور نہ دوڑ دوڑ کر تتلیوں کو پکڑنے کی خوشی اور چھوڑنے کا غم منایا اور نہ شیشم کے درخت پر پڑا جھولا ہی کھلوایا جو سردیوں میں بچوں کو ٹھنڈ لگ جانے کے خدشے سے بند کروایا گیا تھا۔ مجھے تو بس گرمیوں کا انتظار تھا۔ جب تپتی دوپہروں کو سب بڑے لوگ دروازے بند کر کے گھنٹوں خراٹے لیتے ہیں: تو بچوں کو نکل بھاگنے کا سنہری موقع ہوتا ہے۔

گرمیاں آئیں میرے لئے خوشی کا پیغام لیتے ہوئے لیکن میری طرف سے اس خوشی کا اظہار قطعاً نہ ہوا۔ دراصل بشیراں کی محبت میں رہ کر اتنا سا گھنا پن تو مجھ میں بھی آ ہی گیا تھا۔ پھر بھی لمبی گرم دوپہروں کو میں ہوتی اور میری بشیراں۔ اپنی رنگین باتوں

والی ننھی سی کھٹولی میں بشیراں کو سرگوشی میں اُٹھانے کا حکم دیتے — کہ احساس برتری کی خوبُو اتنی قربت کے باوجود ابھی تک قائم تھی۔

وہ کھٹولی اٹھاتی اور ہم دبے پاؤں گھر سے نکل کر لان میں اور پھر لان سے نکل کر دُور باغ کی طرف چل دیتے۔

ہُو کا عالم اور تپتی زمین الاماں .... باغ کو جانیوالے کچے رستے پر دُور سے الاؤ اُٹھتے سے دکھائی دیتے۔ میں چلتے چلتے بار بار بشیراں کی طرف دیکھتی جو دُونوں ہاتھ سر پر اٹھائی کھٹولی پر رکھے بڑے سکون سے ننگے پاؤں دھپ دھپ کرتی چلی جارہی ہوتی جیسے یہ تپتی زمین اُس کے لئے نرم نرم گھاس ہو۔ اُس کے ڈھیلے کرتے میں جوان سینے کے زیر و بم کی تال پر مجھے دل ہی دل میں گنتی پڑھنے کا بڑا مزہ آتا اور میں بڑی محویت کے عالم میں اُس کے سینے پر نظریں جمائے منہ ہی منہ میں وَن ٹُو تھری ... فور فائیو سکس کا وِرد کرتی چلی جاتی۔

جب اچانک چلتے چلتے رُک جاتی تو ہماری منزل آچکی ہوتی۔ باغ کی نرسری کا علاقہ جہاں گھنے درختوں کی چھاؤں بلکہ اندھیرے میں طرح طرح کی کھاد، پودوں اور بیجوں تلوں سے عجیب طرح کی سڑاند اُٹھ رہی ہوتی۔ کھٹولی بچھ جاتی اور ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر فتح مندی سے مسکراتے۔ تب میں بے قراری سے کل کی ادھوری بات سننے کی خواہش کرتی جو کبھی بھی مکمل نہ ہو پاتی۔ میں اصرار کرتی — اچھا تو پھر بشیراں بتانا پھر جب اُس عورت کے گھر بلی کا بچہ پیدا ہوا تو پھر کیا ہوا ؟ لیکن میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے ہی وہ کوئی سنسنی خیز قسم کی نئی بات شروع کرچکی ہوتی کہ پچھلی بات کو بھول کر میں دیدے کھولے اُسی کو حیرت سے سنتی رہتی — ایک تھی نا عورت —۔ بات ہمیشہ یہاں سے شروع ہوتی اور ختم اس تنبیہہ پر ہوتی کہ بتانا کسی کو نہیں !
اور وہ عورت ہمیشہ اڑوس پڑوس یا ہمارے جاننے والیوں میں سے کسی کا نام ہوتا جس کے مختلف قسم کے جانور پالنے کے شوق کو عجیب و غریب رنگ دے کر پیش کرتی اور اس کے ہاں عجیب الخلقت بچوں کی پیدائش سے ہوتی ہوئی بات کل پر ٹال جاتی۔ یا پھر وہ اپنے ماں باپ کی "مشکوک" حرکات و سکنات کا رپورتاژ مجھے من و عن سناتی کیونکہ اُس کا کُل گھر ایک کمرے پر مشتمل تھا جس میں نو دس افراد سوتے۔ مجھے بھی اپنے گھر ایسی باتوں کی تصدیق کے لئے تاکید کرتی لیکن میرا گھر چونکہ چار پانچ کمروں پر مشتمل تھا اس لئے میں اپنے ماں باپ کی "مشکوک" حرکات کو نوٹ نہ کرسکی۔ لیکن اس کی باتوں پر ایمان کی حد تک یقین کرتی چلی گئی۔
جب وہ بات کررہی ہوتی تو اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ میرے چہرے پر منتقل ہوتے رہتے۔ میرے ہاتھوں میں سوئیاں چُبھ چُبھ کر ڈھیروں پسینہ آتا رہتا۔ اور میں پودوں کی اس نرسری کے حبس میں بشیراں کے ساتھ .... اُس کی بُو سے بے نیاز دم سادھے بیٹھی رہتی اور وہ بڑی خوبصورتی سے بات کو کسی انتہائی حیران کن موڑ پر لاکر کل پر ادھار کردیتی — کسی ماہر داستان گو کی طرح — اور میں حیران بلکہ پریشان ہوکر کل کا انتظار شروع کردیتی اور وہاں سے آکر چپکے سے بستر پر لیٹ کر سوتی بن جاتی

بشیراں کو تو ان من گھڑت قصوں سے جو کوئی تسکین ہو تو ہو لیکن میرے ننھے سے ذہن کا سکون غارت ہوگیا تھا۔ میں نجانے کیوں اپنے ماں باپ سے ذہنی طور پر کٹتی جارہی تھی۔ کبھی وہ مجھے ہنستے ہوئے بڑے بُرے لگنے لگتے۔ ہمیشہ سے یہ بڑے بوڑھے لوگ کتنی گندی گندی حرکتیں کرتے ہیں۔ میں نفرت سے سوچتی۔

کبھی کبھار جب ایک سی باتیں سنتے سنتے میرا جی بھر جاتا تو وہ میرا تجسس اور توجہ برقرار رکھنے کے لئے ان "حرکتوں" میں ایسی کشش اور لذت کا اظہار ایسے بے قرار انداز میں کرتی جو اُس وقت میرے لئے قطعی ناقابلِ فہم تھے لیکن صرف تجسس کے

تخلیق

ہاتھوں مجبور ہو کر میں سنتی رہتی اور ہزاروں سوال جو میرے ذہن میں کلبلاتے وہ اُن کا جواب ہمیشہ پھر کسی وقت پر ٹال دیتی۔ حتّیٰ کہ ایک دن اُس نے مجھے بڑی مخمور انگڑائی لے کر یہ خوشخبری سُنائی کہ اُس کے چاچے کے لڑکے سے اس کی شادی ہو رہی ہے۔ وہ اتنی خوش تھی کہ درختوں کے تنوں کو باہوں میں بھینچ بھینچ کر دیر تک پاگلوں کی طرح ہنستی رہی۔ اُس دن اس نے مجھے کوئی بات بھی نہ سُنائی اور نہ میرے کسی سوال پر کان دھرا اور وہ کہتی رہی کہ اب نہیں کل بتاؤں گی — لیکن وہ کل پھر کبھی نہیں آیا۔

وہ شادی کی تیاریوں میں کھو گئی۔ حالانکہ بظاہر کوئی تیاری نظر نہ آتی تھی۔ میں نے ایک دو مرتبہ بلانے کی کوشش کی تو وہ ٹال گئی۔ اور میں بوجھل دل لئے گھر چلی آئی۔

اُس کی شادی ہو گئی۔ وہ سسرال چلی گئی اور میں کئی دن تک اُداس رہی۔ بہت دن گزر گئے۔ ایک تو شاید اس کی باتوں کی یکسانیت کا اثر تھا دوسرے اس کے سلوک کا اور یہ کہ میرا دھیان بشیراں سے کچھ نہ کچھ ہٹ ہی گیا۔ اور میں آہستہ آہستہ اس کو بھول گئی۔ اور پھر — جوں جوں بڑی ہوئی بشیراں کے بتلائے ہوئے رازوں کا جھوٹ فاش ہوتا چلا گیا۔ اب جب کبھی بشیراں کا خیال آتا ہے تو لگتا ہے جیسے کم بخت اندھی ندی تھی — اور آج چھت پر سے اترتے اُترتے اچانک ہمسائی کی سات آٹھ سالہ بچی کی آواز اسی لہک کے ساتھ میرے کانوں میں پڑی تو میں نے چونک کر جلدی سے اُس کے صحن میں جھانکا۔ وہ بچی صحن میں بچھے پلنگ پر ڈھیر ہوئے بستروں پر کود رہی تھی۔ اور اسی پرودھم کے ساتھ لہک لہک کر بول رہی تھی۔ وَن ٹو تھری — فور فائیو سکس۔ نجانے کیوں میرا دل چاہا کہ میں فوراً اُس کی ماں کے پاس جاؤں اور کہوں کہ اپنی بچی کے اردگرد پھرنے والوں پر کڑی نگاہ رکھو ورنہ ....

بلائنڈ ڈیٹ[ے]

سیّدہ عبیدہ
(امریکہ)

سوشل سیکورٹی کے ہال نما کمرے میں بیٹھے ہوئے اُسے دو گھنٹے ہو چکے تھے، اُس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ سارے بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں اُونگھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی کھانسی کی آواز سے کمرے کی خاموشی میں ارتعاش پیدا ہوتا۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جو ۶۵ سال کی عمر میں ریٹائر ہوئے اور ان کا گذارہ اب سوشل سیکورٹی پر ہوتا ہے۔ سارا ابھی ۱۰ سال سے اس دفتر ہر ماہ آتی ہے اور اپنی تنخواہ میں سے کٹی ہوئی رقم کو مع منافع کے وصول کر رہی ہے اور اب بھی خود کو سب سے بہتر سمجھتی ہے۔ اُس نے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا وہ ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا۔ سارا کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ اُس کا جی چاہ رہا کوئی تو اس سے بات کرے۔

وہ شخص ہلکا ہلکا سو رہا تھا۔ ایک جھٹکے سے اُٹھ جاتا پھر آنکھیں بند کر لیتا۔ اُس نے دیکھا اُس کی پتلون کا رنگ بار بار واشنگ مشین میں دُھلنے کی وجہ سے بالکل اُڑ چکا تھا۔ جوتے بھی کافی پُرانے تھے۔ ہاں اس عمر میں کون اتنا دھیان رکھتا ہے۔ تنہا زندگی۔ بچے اپنے گھروں میں مگن۔ یہ تو شکر ہے کہ گورنمنٹ نے سوشل سیکورٹی کا بندوبست کر رکھا ہے۔

پھر اُس نے اُس شخص کو بغور دیکھا۔ یہ شخص کتنا دیکھا بھالا لگتا ہے۔ اُس نے آنکھوں کو دو چار بار مُوندا۔ عینک پرس میں سے کیا نکالنی، وہ ہنس دی۔ کئی لوگ آئے اور چلے گئے۔

ارے مجھے کیا ہو رہا ہے۔ دراصل وہ اپنی عادت سے مجبور تھی۔ روزانہ دوپہر کے وقت وہ اپنی پڑوسن کے پاس اپنی کیوبن کافی لے کر چلی جاتی۔ دُنیا جہان کی باتیں کرتی۔ پہلے کتنے اچھے رواج تھے۔ پولیٹیکل حالات مختلف تھے۔ اور اتنی مہنگائی کہاں تھی اور اب دو گھنٹے سے ہونٹ بند کئے بیٹھی تھی اُسے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ یہ لوگ کتنے خوش قسمت ہیں۔ کیا اطمینان سے سو رہے ہیں جیسے اپنے بیڈ روم میں ہوں۔ بالآخر اُس نے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو ہلایا۔ سُنیں۔ لائٹر ہے آپ کے پاس۔

ہاں۔ اور اُس نے لائٹر دے دیا۔

ے BLIND DATE.

لائٹر واپس دیتے ہوئے بولی۔ پتہ نہیں آج اتنا رش کیوں ہے اور دیکھا آپ نے دفتر والے بھی جیسے اندر سو رہے ہیں۔ ابھی تک ۳۷ واں نمبر چل رہا ہے۔ اُس نے نمبر پلیٹ کو پڑھا۔

NOW SERVING 37. دیکھا آپ نے

اُس شخص نے کوئی دھیان نہ دیا۔ سوچا کس قدر باتونی عورت ہے۔

پھر وہ بولی۔ آپ کو کتنا عرصہ ہوا ریٹائر ہوئے۔

عرصہ ہو گیا۔ کچھ یاد نہیں۔ وہ چپ ہو گیا۔ مجھے بھی ایسا لگتا ہے جیسے صدیوں سے زندگی رُک گئی ہے۔ نہ کوئی نئی بات۔ نہ کوئی نیاپن۔

اچھا سُنیں۔ آپ کام کیا کرتے تھے۔

اُس مرد نے گھور کے اُسے دیکھا۔ اور پھر مسکرا دیا۔ آپ کو کہیں دیکھا ہے۔

ہاں مجھے تو کافی دیر سے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے آپ کو دیکھا ہے اور قریب سے۔

لیکن کہاں اور کیسے۔ اس شخص نے ذہن پر زور دیا کہ وہ اچانک بولی۔ بلائنڈ ڈیٹ۔

ہاں۔ وہ زور سے ہنس دیا۔ سچ بلائنڈ ڈیٹ۔

یاد ہے کتنا عرصہ ہوا ہو گا۔

یہی کوئی سو سال پہلے۔

ایسے ہی لگ رہا ہے۔ آپ کتنی بدل گئی ہیں۔ نہ آنکھوں میں وہ لپک اور نہ ہی رنگ میں وہ چمک۔ بس بول ویسے ہی رہی ہیں۔

تو کیا اب میں ۱۸ سال کی لڑکی رہتی۔ آپ نے غور کیا۔ آپ بھی کافی بدل چکے ہیں۔

ہاں یہ تو میں بھول گیا۔ اب ہم سوشل سیکورٹی پر گزارہ کرتے ہیں۔ اور ——

اچھا یہ تو بتائیں۔ کیا وہ آپ کی پہلی بلائنڈ ڈیٹ تھی۔

جی۔ وہ تھوڑا سا شرما گئی۔ لمحے بھر کو وہ کئی برس پہلے چلی گئی۔

جی۔ وہ آپ کے ساتھ پہلی تھی۔

آپ نے مجھے پسند نہیں کیا تھا۔

بس ایسے ہی ایسا لگا تھا۔

اچھا کیا میں آپ کو بہت اچھی لگی تھی۔

ہاں۔ ایک دم بہت اچھی۔ آپ کو یاد ہو گا میں نے اگلی صبح آپ کو فون کیا تھا۔ اور پوچھا تھا۔ آج آپ کس وقت فارغ ہوں گی۔ ڈنر پر چلیں گے اور پھر کلب۔

سارا نے دور دیکھا۔ کھُلی کھڑکی سے وہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ آہستہ سے بولی۔ میں نے انکار کر دیا تھا۔

اب تو بات گزر گئی وجہ جان سکتا ہوں۔

لیکن سارا کا نمبر آگیا تھا۔ وہ اٹھی اور بولی۔ بعد میں ملتے ہیں۔

سوشل سیکورٹی وصول کرنے کے بعد وہ واپس آئی (امیرا[1]) سنیں۔ اب دیر ہو چکی ہے۔ آپ میرا نمبر لکھ لیں

۵-۹۹۷ - ۸۲۴ - اور وہ خدا حافظ کہہ کر گھر آگئی۔ آکر اس نے اپنے البم نکالے۔

سارا کی پیدائش سے لے کر اب تک کی تصویریں۔

نیویارک کی شدید ٹھنڈ، سارا اور اس کے ماں باپ تصویر میں کیسے مسکرا رہے تھے لیکن اس نے بیک گراؤنڈ میں دیکھا۔ دونوں کے اصل چہرے کتنے گھناؤنے تھے۔

ماں: شوز لیوص تمہیں خود کمانا چاہیئے۔ میں کما کما کے تھک گئی ہوں۔ اور تمہیں صرف شراب پینے سے دلچسپی ہے۔

باپ: اور میں تمہاری رکھوالی کرتے کرتے۔ تمہیں اپنے بوائے فرینڈ سے فرصت ہو تو مجھے دھیان دو۔

وہ بستر میں ٹھنڈ میں دبکی دونوں کی آوازیں آنکھیں بند کر کے سنتی اور جب ان کو دیکھتی گھبرا جاتی۔ اس کا باپ کیوبن تھا اور ماں پورٹوریکن۔ یہ بھی بہت بڑا اختلاف تھا۔ صرف ایک زبان ہونے سے ذہن ایک نہیں ہو جاتے اور وہ شدید سردیوں کی رات۔ جب اس کے باپ نے اس کی ماں سے کہا۔

جاؤ اپنی حرام کی اولاد کو پکڑو، اور اپنے بوائے فرینڈ کے پاس رہو۔

ماں نے کچھ نہیں کہا۔ نہ روئی، نہ آہ و فغاں کی، اپنا اٹیچی لیا اور اسے انگلی سے لگا کر اپنے بوائے فرینڈ کے گھر آگئی۔

اس کی ماں ساری رات اپنے بوائے فرینڈ کے بند کمرے میں باتیں کرتی رہی، وہ باہر صوفے پر اکیلی لیٹی سوچتی رہی میں کس کے پاس رہوں۔ پپا نے گھر سے نکال دیا، اور ماں مجھے باہر صوفے پر رکھ کر بھول گئی ہے۔ اس کی ہچکی بندھ گئی۔

اس نے محسوس کیا۔ ارے وہ تو واقعی رو رہی تھی۔ اس نے تصویر کا پنا الٹ دیا۔

دوسری تصویر میں سارا ۱۵ سال کی خوبصورت لڑکی مسکرا رہی تھی۔ وہ برگر کنگ میں کام کرنے لگی۔ اور ۱۲۰ ڈالر ہفتہ کمانے لگی۔ اب وہ خوشحال تھی۔ رہتی اپنی ماں اور اس کے بوائے فرینڈ کے ساتھ تھی اور پیسے بچانے لگی۔

سارا نے فیصلہ کر لیا۔ میں اس ماحول میں نہیں رہوں گی۔ اپنا اپارٹمنٹ لے کر رہوں گی اور جب اس بات کا تذکرہ اس نے ماں سے کیا تو اس نے لمبا سا لیکچر دے دیا۔

دیکھو کوئی اچھا سا بوائے فرینڈ ڈھونڈ لو، یہ لڑکیوں سے دوستی عمر تباہ کر دیتی ہے۔ میں سب سمجھتی ہوں۔

وہ بولی۔ جو مرضی سمجھ لو۔ میں نے یہاں نہیں رہنا۔ اور اس کی ماں نے زیادہ دخل دینا مناسب بھی نہ سمجھا۔

اب سارا خود مختار تھی۔ اپنا کمرہ اپنا باتھ روم اپنی کپڑوں کی الماری، وہ خوش تھی۔ سکول سے آتی برگر کنگ جاتی اور واپس آ کر اپنی سہیلی سے اپنے ماضی کے تذکرے کرتی۔ اس نے البم کو ایک طرف رکھا اور آنکھیں موند لیں۔

---

[1] امیرا: سپینش لفظ ہے اس کا مطلب ہے۔ دیکھو یہاں۔ ہر بات پر اسی طرح مخاطب کرتے ہیں۔)

اس کے ساتھ کام کرنے والی ہیلن نے اسے ایک دن پوچھا۔
سُنو۔ تمہارا کوئی بوائے فرینڈ ہے ؟
" نہیں "
بہت بیوقوف ہو۔ تمہاری ٹیک کیئر (TAKE CARE) کون کرتا ہے۔
میں خود
اُو نو۔ تمہیں پتہ ہے اگر تمہارا بوائے فرینڈ ہو تو تمہیں کتنا آرام ہو، تمہارے اپارٹمنٹ کا کرایہ وہ دے، بل وہ دے۔ اور تم صرف عیش کرو۔
یہ بات سارا کے دل کو اچھی لگی۔ اور اُس شام شاور لیتے ہوئے اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔
ہاں۔ وہ خود سے باتیں کرنے لگی۔ اچھی خاصی خوبصورت تو ہوں۔ نیلی چمکتی نیلم جیسی آنکھیں، اور ایک ہی قطار میں موتیوں جیسے چمکتے دانت۔
اور وہ پھر وہ دن بھی آ گیا، جب ہیلن نے اسے کہا۔ سُنو تم نے کبھی بلائنڈ ڈیٹ کی ہے۔
نہیں
اچھا شام تیار رہنا۔ چلیں گے۔
سنو، پھر کیا ہو گا ؟
بھئی کچھ نہیں وہی جو ہونا چاہیئے۔
میں سمجھی نہیں۔
سنو، میرا ایک بوائے فرینڈ ہے۔
ہاں مجھے معلوم ہے
چلو ٹھیک تمہیں معلوم تو ہے اور اس کا ایک فرینڈ ہے۔ اور اس کی کوئی گرل فرینڈ نہیں۔ اور تمہارا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ــ بس معاملہ فٹ ہے۔
وہ تھوڑا پریشان ہوئی۔ "لیکن ایک دم"۔
" نہیں تو کیا کئی دم"۔ اور ہیلن قہقہہ لگاتی چلی گئی۔
شام کو اُس نے اپنا بہترین ڈریس پہنا، ہلکے بندے پہنے۔ میک اپ کیا۔ خوشبو لگائی اور خود کو دیکھا۔ ہوں ٹھیک ہے !
اور اس طرح وہ ہیلن کے ساتھ پہلی بلائنڈ ڈیٹ پہ پہنچ گئی۔
ہوٹل کے کارنر میں ٹیبل پر دو نوجوان بیٹھے تھے۔
ہیلن نے تعارف کرایا۔ یہ گار رشیا ہے اور اس کا دوست میر لیو۔

تحقیق

سارا نے نظر اٹھا کے دیکھا۔ مدھم آنکھوں اور لمبے قد والا نوجوان اُسے جچا نہیں۔ پھر بھی وقت کا تقاضا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

ہیلن اور گارشیا تو اس طرح ایک دوسرے میں گم ہوئے کہ دُنیا جہاں بھول گئے۔ وہ اُس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

وِسکی۔ وائین یا بیئر

وائین

گُڈ۔ اچھا ٹیسٹ ہے۔

پھر میریو نے اُس کے لب چھُو لئے۔

سارا کو اُس کی سانس اچھی نہیں لگی۔

نہیں۔ یہ بندہ نہیں چلے گا۔ اُس نے دل میں سوچا۔ لیکن مجبوری تھی۔ ہیلن کے ساتھ ہی واپس جا سکتی تھی۔ اور وقت نہ چاہتے ہوئے بھی گزار لیا۔

وہ لیٹے لیٹے مسکرا دی۔ پہلا تجربہ ہی دل کو نہ بھایا۔ اس کے بعد زندگی تجربوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ دوسری بلائنڈ ڈیٹ سارا کے لئے تلخ تجربہ تھا۔ وہ نوجوان سارا کے دل میں کھب کھب گیا۔ سارا نے پہل کرنے میں دیر نہ لگائی اپنی ہر پسند بتادی۔

مجھے چائینز کھانا اچھا لگتا ہے۔

مجھے آئس کریم اٹیلین اچھی لگتی ہے۔

زیادہ تر سکرٹ پہننا پسند کرتی ہوں۔

اور تمہیں کالا سوٹ بہت اچھا لگ رہا ہے

وہ مسکرایا۔ اُس کا رویہ عجیب مُرا مُرا تھا۔ جیسے اُسے وقت گزارنا ہے اور سارا کو سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ یہ معاملہ پٹے گا نہیں۔ اب وہ معصوم سارا نہیں تھی۔ تیز طرار لڑکی نے بڑھ کے ٹام کے گال کو چومتے ہوئے کہا۔

کوئی بات نہیں ایسا ہوتا ہے،

وقت کو خراب نہیں کرتے انجوائے تو کرو۔ اور وقت نے لمحے بھر میں چھلانگ لگادی۔

اس واقعہ کے بعد سارا نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔

۲۵ سال کی عمر کم نہیں ہوتی اور پھر وہ ایک بچے کی ماں بھی تھی۔ اور فیصلے کو عملی جامہ پہنانے میں سارا کو دیر نہیں لگی۔ اُس نے ایک کپڑے کے سٹور پر کام کر لیا۔ کمیشن پر پیسے زیادہ بنانے لگی۔ اور یہیں جارج کو ملی۔ اس کی میٹھی میٹھی باتیں سارا کو بھا گئیں۔ اور وہ پھر سے ۱۶ سالہ سارا بن گئی۔ جارج نے بھی اسے زندگی کا لطف دیا۔ پھر وہ اپنی شادی پہ دل کھول کر ہنسی، لیکن کبھی ہنستے ہنستے آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے۔ یہی سارا کے ساتھ ہوا۔ وجہ با وجود تلاشنے کے نہ جان سکی کہ دو سال ہی میں زندگی تھم گئی۔ وجود لیے جان لاش بن گئے۔ اور ذہن سرد ہو گئے اور ایسی

سردی میں طلاق آگ بن کے گری۔

وہ پھر سے اکیلی رہنے لگی۔

بیٹا جوان ہوگیا، اور اپنا گھر بنا کے الگ ہوگیا۔

سارا سردیوں کی یخ راتوں میں کتابیں پڑھتی۔ تصویریں دیکھ لیتی۔ اور خود سے باتیں کرتی۔ صبح اپنی ہمسائی کے پاس چلی جاتی۔ مہینے کی ۵ تاریخ کو سوشل سیکورٹی لاتی، اور اپنی گروسری (GROCEERY) خریدتی۔ زیادہ تر سوپ بنا کے پی لیتی یا میش پٹاٹو (MASH POTATO) کیونکہ کافی اُس کی جان تھی، کڑوی کسیلی کافی۔ زندگی جیسی۔ اور سوچتے سوچتے سوگئی۔ کہ ٹیلیفون کی گھنٹی پر اس کی آنکھ کھلی۔

ہیلو! اُس نے سوتے سوتے کہا۔

یس میں لیو بول رہا ہوں۔

ہاں۔ کہو!

سنو۔ آج شام فارغ ہو تو ڈنر پر چلیں اور پھر کلب۔

سارا نے جاگتے ہوئے کہا کس وقت؟

کرؔم حیدری

○

شب ستارے دیکھنا دن راہِ فردا دیکھنا
کب سے ہے اپنا مقدّر یہ تماشا دیکھنا

چاند پر بھی میں پہنچ جاؤں تو پاؤں خاک ہی
میری قسمت دیکھنا، میری تمنّا دیکھنا

اس خرابے میں کہاں شادابیاں ہوں گی مگر!
چار سو بہتے ہوئے آنکھوں کے دریا دیکھنا

ہو نہ ہو رازِ محبّت فاش ہو جانے کو ہے
بزم میں ڈھونڈ لا گیا اک روئے زیبا دیکھنا

لذّتِ پیہم کا باعث تھا مسلسل اضطراب
ہم نے خود چاہا نہ تھا آرامِ دُنیا دیکھنا

کام آساں کر دیا ہے مرگِ بے ہنگام نے
ورنہ مشکل تھا بہت انجام اپنا دیکھنا

ساحلِ دریا پہ مجھ سے خضر نے ہنس کر کہا
ڈوب کر دریا میں تھا احوالِ دریا دیکھنا

ذہن سوئے تھے تو آنکھیں بجھ گئیں ورنہ یہاں
ادھ کھُلی آنکھوں سے بھی ممکن تھا دُنیا دیکھنا

پھاندنے کو ہے کرؔم انساں حدودِ کائنات
مشتِ خاکِ ناتواں کے سر میں سودا دیکھنا

○

اب گلستانِ شوق بھی صحرا بدوش ہے
ہم رنگِ خارزار کفِ گل فروش ہے

جب لمحہ لمحہ قاتلِ ہوش و خرد ہُوا!
کب ہوش میں ہے جس کو تمنّائے ہوش ہے

دریائے وقت بڑھ کے بنا بحرِ بے کراں
اس بحرِ بے کراں میں نہ فردا نہ دوش ہے

یہ بھی ہے اب سیاستِ فرزانگی کا رنگ
دل بے خبر ہے اور زباں پُر خروش ہے

ہمّت کہاں کہ حرفِ وفا اب زباں پہ لائیے
ہو بھی اگر تو کون یہاں حق نیوش ہے

دل اب قمار خانہ ہے لیکن لُٹا ہُوا
سر اک نگار خانہ مگر بارِ دوش ہے

ساقی نہ مئے نہ جامِ محبّت رہا کرؔم!
محفل میں کس کو اب ہوسِ نا و نوش ہے

اکبر کاظمی

شاخ پر جب گلاب دیکھا ہے
جاگتے میں بھی خواب دیکھا ہے

رنگ ہے وہ مرے ستارے کا
تو نے جو آفتاب دیکھا ہے

اے صبا یہ بتا گلستاں میں
کوئی خانہ خراب دیکھا ہے

خیر و خوبی کے آستانوں کو!
میں نے زیرِ عتاب دیکھا ہے

میں نے اک ماہ رو کی آنکھوں میں
ڈوبتا ماہتاب دیکھا ہے

تتلیاں کچھ ہواؤں کی زد میں
ہو رہی تھیں خراب دیکھا ہے!

کتنی چاہت سے خط لکھا تھا اسے
کیا ملا ہے جواب دیکھا ہے

تو نے سچائی کے بطن سے کبھی!
خون اگلتا عذاب دیکھا ہے

کہہ رہا تھا یہ لمحۂ موجود!
آپ نے کیسا خواب دیکھا ہے

دور تک روشنی کے سائے میں
ڈگمگاتا شہاب دیکھا ہے

جس کی خوشبو ہے تجھ میں تو نے اسے
اے شبِ ماہتاب دیکھا ہے

میں نے اس حسنِ دلفریب میں بھی
رنگ دیتے سراب دیکھا ہے

آج اس گلبدن کی آنکھوں میں
شعلۂ نو شباب دیکھا ہے

کاظمی میں نے روئے شبنم پر
جلوۂ حسنِ آب دیکھا ہے

انور سدید

کتنے کانٹے چبھو گئی ہے رات
درد دل کا بلو گئی ہے رات

صبح اتری تو یوں ہوا محسوس
اک سفینہ ڈبو گئی ہے رات

میری آنکھوں کی ہار مالا میں
کتنے آنسو پرو گئی ہے رات

رنگ سارا اتر گیا دل کا
داغ جتنے تھے، دھو گئی ہے رات

اب نہ ٹوٹے گا حوصلہ دل کا
کشتِ امید بو گئی ہے رات

یوں لگا صبحدم مجھے انور!
میرے پہلو میں سو گئی ہے رات

تابش صمدانی

شامِ غمِ فراق کے سائے ڈھلے تو ہیں!
کچھ مرحلے حیات کے آساں ہوئے تو ہیں

وہ چھپ گئے ہیں دیدہ و دل سے تو کیا ہُوا
جلوے نہیں رہے ہیں مگر آئینے تو ہیں

آ جائیں راس میرے چمن کو خدا کرے
دو چار پھول صحنِ چمن میں کھلے تو ہیں

ایسے لگا وہ جیسے کبھی آشنا نہ تھے
ملنے کو بارہا سرِ راہے ملے تو ہیں

یہ اور بات رنگ وہ بھرتے ہیں کس قدر
میری زباں سے میرے فسانے سُنے تو ہیں

دادِ ہنر ملے نہ ملے یہ ہے اَور بات
میں نے بساطِ شوق پہ خاکے بھرے تو ہیں

تابش تلاش کون سے شام و سحر کی ہے
شام و سحر کے اب بھی وہی سلسلے تو ہیں

انوار فیروز

زیست کا نقشہ برابر دیکھنا!
ڈوبتے سورج کا منظر دیکھنا

کیوں لگے الزام خود پہ دیکھنا
جھانک کر تم دل کے اندر دیکھنا

ہیں صدف مٹی میں بھی کتنے یہاں
تہ سے دریا کی اُبھر کر دیکھنا

چاٹ کر زخموں کو وہ پھر آ گیا
پھر مقابل ہے وہ لشکر دیکھنا

سارے بادل ٹوٹ کر برسے وہیں
پی گیا پانی سمندر دیکھنا

صحن میں ہوگا اگر پھلتا شجر
آئیں گے اس سمت پتھر دیکھنا

پاؤں جتنے چاہو تم پھیلاؤ پر
پہلے یارو اپنی چادر دیکھنا

کر گیا محفل کو پاگل سر بسر
ایک اس کا مسکرا کر دیکھنا

سچ کا سورج دہر میں ہوگا طلوع
حق بھی لکھیں گے سخنور دیکھنا

روشنی لایا ہوں میں انوار اب
بستیاں ہوں گی منور دیکھنا

فراؔز صدیقی

○

یوں میرے شہر کا ہے سراپا لہو میں تر
جیسے صلیب پر ہو مسیحا لہو میں تر

ہر شاخ داغ داغ ہے ہر پھول زخم زخم
دیکھو یہاں بہار کا لاشہ لہو میں تر

ہر سمت کشتگاں کے ہیں پشتے لگے ہوئے
ہر سمت ایک سا ہے نظارا لہو میں تر

آنکھیں کھلیں تو کوئی بھی حسرت نہیں رہی
سپنے میں دیکھا نقشِ تمنّا لہو میں تر

دشمن کوئی نہ اُترا خلاؤں سے اے فراؔز
اپنے ہی ہاتھوں ہو گئی دُنیا لہو میں تر

○

بڑھ رہے ہیں ہم جنوں کی شعلہ سامانی کے ساتھ
مرحلے کیوں طے نہ ہوں گے یار و آسانی کے ساتھ

زندگی، وَا کر رہی ہے اک نیا بابِ نجات
جھونپڑے ٹکرا رہے ہیں قصرِ سلطانی کے ساتھ

کوئی سازش، وہ نقوشِ فن مٹا سکتی نہیں
اہلِ دل بھرتے ہیں جن میں رنگ قربانی کے ساتھ

ہم برہنہ پا ہیں لیکن کج کلا ہوں کے حریف
کیوں نہ اہلِ شہر دیکھیں ہم کو حیرانی کے ساتھ

ہم نے اس وحشتِ تمنّا میں دکھائے ہیں فراؔز
کتنے لافانی کرشمے اِک دلِ فانی کے ساتھ

ضیاؔء علیگ
(کینیڈا)

ہنگامۂ وحدت ہے آئینہ در آئینہ
بس ایک ہی صورت ہے آئینہ در آئینہ
پہلے تو ستم کوشی، پھر زود پشیمانی!
احساسِ ندامت ہے آئینہ در آئینہ
اک رنگ ہے چہرے پر، اک خواب ہے آنکھوں میں
کیا عالمِ حسرت ہے آئینہ در آئینہ
نقشہ تیری قامت کا بیدار ہے آنکھوں میں
گویا کہ قیامت ہے آئینہ در آئینہ
وہ سامنے آکر بھی رہتے ہیں حجابوں میں
اک عالمِ خلوت ہے آئینہ در آئینہ
چہروں کو ضیاؔء ہم نے لفظوں سے سجایا ہے
افکار کی ندرت ہے آئینہ در آئینہ

حفظ الکبیر
(کینیڈا)

اُٹھتے ہیں جانِ جاں کے قدم اب ہر اک طرف!
وحشی غزال کرتا ہے رم اب ہر اک طرف
رخشندہ بام پہ مہِ شب تاب ہے تمام
افسردہ آفتاب، صنم، اب ہر اک طرف
دستِ حنا و لالۂ عارض کا بانکپن —!
دل کا کھلا ہے باغِ ارم اب ہر اک طرف
پھیلے ہوئے تھے دشتِ کراں کے جو فاصلے
زنجیرِ راہ، زلفوں کے خم، اب ہر اک طرف
تیغِ زبانِ خلق سے آزار کے محن!
وحشتِ سموم و زہرِ ستم اب ہر اک طرف
اک عکسِ رُخ ہے نرم اُجالوں میں محوِ خواب
تخئیلِ شب میں جذبوں کے رم اب ہر اک طرف
اس کی گلی کی یاد میں کوئے فرنگ میں
دوڑے ہیں ہم کے دیدۂ نم اب ہر اک طرف

سرورؔ کاشمیری

ہر شخص بے سکوں یہاں دیوار و در میں ہے
صحرا سے بھی زیادہ اُداسی نگر میں ہے
دل میں ہے تیری یاد سمندر بنی ہوئی
مُدّت سے یہ سفینہ غموں کے بھنور میں ہے
میں کٹ کے زخم زخم ہوا جس کے واسطے
کونپل کی طرح کون یہ شاخِ شجر میں ہے
میں آئینہ ہوں مجھ پہ اُجاگر ہیں خد و خال
جو بھی ہے تیرا عیب، وہ میری نظر میں ہے
میں ہی تو روشنی کا مسافر ہوں اس لئے
گرد و غبار صرف مِری رہگذر میں ہے
یہ کائنات کس کے سبب سرخرو ہوئی
کس کے لہو کا رنگ یہ شام و سحر میں ہے
دامن پہ گر گیا تو ستارہ کہیں گے لوگ
سرورؔ اِک ایسا اشک مِری چشمِ تر میں ہے

احمد شریفؔ

بیج بو کر تجھے کیوں فکرِ زیاں کھاتی ہے
رُت کی تبدیلی نئی فصل اُگا جاتی ہے
عزمِ تسخیر ہی اِنسان نہیں کرتا، ورنہ
برق تو قوسِ قزح میں بھی بدل جاتی ہے
زلزلے آئے مگر میرا مکاں ڈھا نہ سکے
دیکھئے، کب مری قسمت مِرا گھر ڈھاتی ہے
مَوجِ طوفاں کی لے آتی ہے ساحل پہ اُنھیں
اہلِ ساحل کی مَدد جن کو ڈبو جاتی ہے
سرد مہری جسے دُنیا نے بنایا ہے شعار
کون جانے، مِرے جذبات کو گرماتی ہے
خُوب دیتی ہے سنبھالا مجھے رہ کی ٹھوکر
ٹھوکریں کھانے سے اک راہ نکل آتی ہے
انکسار ایک عجب چیز ہے دُنیا میں شریفؔ
شاخ ہو جائے ثمردار تو جھک جاتی ہے

بشیر سیفیؔ

ٹھیک ہے اب تیری زد سے ماورا میں بھی نہیں
اک نشانے پر مگر ٹھہرا ہوا میں بھی نہیں

میری سوچیں تیری سوچوں سے نہیں، ہیں مختلف
تو اگر انسان ہے تو دیوتا میں بھی نہیں

دوستوں پر جان دینا گر ترا ایمان ہے
اپنے یاروں کو اکیلا چھوڑتا میں بھی نہیں

وہ بھی میری ذات سے کچھ لاتعلق ہو گیا
اور اس کے واسطے اب سوچتا میں بھی نہیں

مصلحت کے لفظ سے سیفیؔ لسے بھی کد سی ہے
اور سچّی بات سے مُنہ موڑتا میں بھی نہیں

سعید کوکبؔ
(دوبئی)

جب کہ ملنے سے اجتناب نہیں
کیوں کھُلے پھر دلوں کے باب نہیں
تیرگی گھر کی دُور کیسے ہو!
مہرباں ہم پہ آفتاب نہیں
کیا قیامت قریب آ پہنچی!
کیوں دُعائیں بھی مستجاب نہیں
وہ پیمبر ہوں میں زمانے میں
جس پہ اُتری کوئی کتاب نہیں
چیز ہر اک یہاں میسّر ہے
صرف انسان دستیاب نہیں
مرنے والے کمال کرتے ہیں
جینے والوں کا بھی جواب نہیں
عشق میں خامیاں تو ہیں بے شک
کام ایسا مگر خراب نہیں
تو مرا ذوقِ مے کشی تو دیکھ—!
تیری آنکھیں نہیں، شراب نہیں
وقتِ فرصت میں کیا پڑھوں کوکبؔ
کوئی چہرہ — کوئی کتاب نہیں

کاوش عبّاسی
(سعودی عرب)

ترا شعار، تری دھج مرے خیال میں ہے
سبھاؤ غم میں مرے تمکنت ملال میں ہے

وہ تیرا کیفِ تبسّم، وہ والہانہ پن!
مرے جنوں کی چمک بھی ترے جمال میں ہے

ترے تکلّمِ رعنا و خوش خیال کی خیر
جو عیش زخم میں تھا، اب وہ اندمال میں ہے

ادائے ناز ہے تیری کہ ہجر میں اب کے!
علاجِ ہر الم و یاس احتمال میں ہے

وہ بے خودی ہے کہ دل میں سماں سجا ہے کوئی
فراق ڈوبا ہُوا مستیِ وصال میں ہے

فغاں کو زمزمہ کر دے جنوں کو شانت کرے
یہ رنگ بھی تو مرے یارِ خوش خصال میں ہے

بھروسہ بھی کفِ دریائے دل کا کیا کاوش
ابھی تو مانا کہ حد میں ہے اعتدال میں ہے

این اے صوفی

رسمِ دنیا نبھا گیا وہ بھی
چار آنسو بہا گیا وہ بھی

شاہ رگ کو جو گردن دکھتا تھا
سرد مہری دکھا گیا وہ بھی

اس کو خلقت صدائیں دیتی رہی
آج پہلو بچا گیا وہ بھی!

گردِ میرے ہجوم سا کیوں ہے
اک تجسّس میں آ گیا وہ بھی

طاق پر رہ گیا تھا ایک دیا
آج شب بھر بھرا گیا وہ بھی

میں بھی دل کی نہ کہہ سکا کوئی
بات اپنی چھپا گیا وہ بھی

دھند کے ریشمی غلافوں سے
تارا چمکا تو آ گیا وہ بھی

ابر جو تیز دھوپ میں برسا
روشنی میں نہا گیا وہ بھی

خامشی کے اتھاہ سمندر سے
اب کناروں پہ آ گیا وہ بھی

عقل و دانش پہ ناز تھا جس کو
ایک دھوکہ تو کھا گیا وہ بھی

صوفی لہجوں کو بھانپنے والا
کیسی باتوں میں آ گیا وہ بھی

سجّاد مرزا

سرِ شہرِ ادب نفرت کی خُو بُو لے کے نکلے ہیں !
یہ اہلِ نقد جو گھر سے ترازو لے کے نکلے ہیں

وہ جن کے سائے سے وحشی درندے خوف کھاتے تھے
وہی شہرِ ستم میں آج آہو لے کے نکلے ہیں

جو اک مدّت سے اپنی ذات سے باہر نہیں آیا
بڑی چاہت سے ہم اس کو لبِ جُو لے کے نکلے ہیں

کبھی چشمِ عنایت سے زمانے نے نہیں دیکھا
زمانے کے لئے ہم پیار خوشبو لے کے نکلے ہیں

نہ جانے کیوں ڈرا رکھا تھا ان کو اہلِ ساحل نے
مسافر کانپتے ہاتھوں میں چپّو لے کے نکلے ہیں

وہی اک دشمنِ جاں، لشکرِ اعدا میں شامل ہے
اسی کے واسطے ہم اپنے بازو لے کے نکلے ہیں

بھٹکتے ہی نہ رہ جائیں کہیں پھر قافلے والے
شبِ تیرہ میں پھر سجّاد جگنو لے کے نکلے ہیں

صفدر جعفری

درندے شہر میں آباد ہیں انسان صحرا میں !
بہت مدّت ہوئی اٹھتے نہیں طوفان صحرا میں
کبھی انسان صحرا میں کبھی حیوان صحرا میں
دکھاتے ہیں یہ ہنگامے خدا کی شان صحرا میں
امیرِ کارواں کی خودسری سے قافلے والے
بھٹکتے پھر رہے ہیں بے سروسامان صحرا میں
جو ذرّوں کو عطا کر دیں متاعِ نورِ امکانی
ملیں گے قیس اور فرہاد سے انسان صحرا میں
ہمارے شہر کے مسند نشینوں کو خدا سمجھے !
اٹھا کر پھینک دی انصاف کی میزان صحرا میں
وہ نالے جو پہاڑوں کا سکوں برباد کرتے ہیں
سمٹ کر ڈوب جاتے ہیں کسی ویران صحرا میں
یزیدیت، سراسر ظلم، ذلّت اور رسوائی !
شہادت دے گیا اک بولتا قرآن صحرا میں
سرابوں کا تعاقب، تشنگی، غولِ بیابانی
کتابِ زندگی کے باب ہیں، عنوان صحرا میں
ہمیں کیا ہم تو خالی ہاتھ آتے اور جاتے ہیں
لُٹا کرتے ہیں دولت مند بازرگان صحرا میں
ملی تنہائیوں سے اس قدر آسودگی صفدر
بھری محفل میں لگتا ہے کہ ہوں سنسان صحرا میں

کرامت بخاری

آنسوؤں کی قطار آنکھوں میں
ہے عجب انتظار آنکھوں میں

اِک سفر کی تھکان چہرے پر!
ایک غم کا غبار آنکھوں میں

دیکھو ہم تم سے ملنے آئے ہیں
لے کے صدیوں کا پیار آنکھوں میں

میں بھی تم کو چھپا لوں دُنیا سے
تو بھی مجھ کو اُتار آنکھوں میں

لب پہ اک حرفِ آرزو بھی نہیں
خواہشیں ہیں ہزار آنکھوں میں

وقت کے ساتھ مٹتے جاتے ہیں
تیرے نقش و نگار آنکھوں میں

غزالہ نثار

جو نہ چاہا، وہ تقدیر کرتی رہی
خود کو ناحق میں دلگیر کرتی رہی

وقت تھا بے وفا اور میں بے سبب
اُڑتے لمحوں کو زنجیر کرتی رہی

وہ تو جذبوں کو پامال کرتا رہا
میں خیالوں کو تصویر کرتی رہی

آج بھی زہر اُس کو ہی پینا پڑا
کل بھی جو کچھ ہُوا، ہیر کرتی رہی

ہونٹ تھے بند، پر وہ نگاہِ کرم
یوں لگا جیسے تقریر کرتی رہی

جب بھی پروا چلی، تیرے ہی نام کو
دل کے صفحوں پہ تحریر کرتی رہی

شوکت مہدی

○

اماوس کی طرح سج رہ رہی تھی
نہ پوچھو کیا وہ جاں پر سہہ رہی تھی

کہا تو ہے کہ اب افسوس مت کر
یہ مجھ سے ایک پگلی کہہ رہی تھی

اُن آنکھوں سے سمندر کا ٹپکنا
عمارت، کوئی جیسے بہہ رہی تھی

بظاہر تو وہ تھی اک عام لڑکی
مگر خود کو جوالا کہہ رہی تھی

سرِ اشکِ شام کیا منظر تھا مہدیؔ
ندی، دریا کی صورت بہہ رہی تھی

اطہر ناسکؔ

○

دل ابھی سینۂ سیاہ میں ہے
میرا دشمن مِری پناہ میں ہے
میں ابھی تک ہوں چادرِ شب میں
تو ابھی تک ردائے ماہ میں ہے
میں ہوں پاتالِ چشم میں تیرے
تو مِرے خوف کی اتھاہ میں ہے
سارا دُکھ ہے مرے بدن میں مقیم
سارا سُکھ تیری بارگاہ میں ہے
ساری خوشبو ہے تیرے پیکر میں
تیرا پیکر مِری نگاہ میں ہے
ایک جگنو ہے تیرے جوڑے میں
اک ستارہ مری کلاہ میں ہے
ایک دیوار تیرے رستے میں
ایک دیوار میری راہ میں ہے
اک رعونت کا داغ زاہد پر
اک تجلّی سی روسیاہ میں ہے
مَیں بھی مصروف، عجز و فقر میں ہوں
تو بھی مشغول، حشم و جاہ میں ہے
میرا قاتل مِری سپاہ میں تھا!
تیرا قاتل تری سپاہ میں ہے
بھیک مانگو ابھی نہ منصف سے
خوں ابھی کاسۂ گواہ میں ہے
کیوں نہ ہم چھوڑ دیں اُسے ناسکؔ
کوئی لذّت اگر گناہ میں ہے

شفیق آصف

وہ ملا تو جانے کیوں اک شور سا برپا ہوا
بات معمولی تھی پھر بھی شہر میں چرچا ہوا

چل رہی تھیں سارے جنگل میں ہوا کی برچھیاں
پاس ہی اک جھونپڑی میں دیپ تھا جلتا ہوا

رات روئے تھے ستارے بے کسی پر جب مری
چاند کو دیکھا تھا میں نے بے سبب ہنستا ہوا

ساتھ کب دیتی ہیں شامِ دشت میں پرچھائیاں
ایسے عالم میں جدا وہ ہو گیا اچھا ہوا

لوگ کہتے ہیں جسے تصویرِ زخمِ آرزو
گلشنِ احساس میں وہ پھول ہے مہکا ہوا

جانے کب اور کس جگہ سانسوں کو آزادی ملے
دُور تک ہے سلسلہ زنجیر کا پھیلا ہوا

میری آنکھیں رات دن بس اس کی جانب ہیں شفیقؔ
اِن خلاؤں سے پرے وہ کون ہے ٹھہرا ہوا

شاہین کرن

مجھ سے اُس نے اپنے دل کی بات چھپا کر رکھی ہے
لیکن کمرے میں میری تصویر سجا کر رکھی ہے

کالج کے وہ دن، وہ نہر کنارا، پکنک میلے
میں نے اُن لمحوں کی ہر اک یاد بچا کر رکھی ہے

غم کی آگ جلائے اور نہ دُکھ کی دُھوپ ستائے
میری ماں نے میرے لئے یہ دل سے دُعا کر رکھی ہے

لگتا ہے کہ دھرتی امبر جل جائیں گے دونوں
دُور افق پر جانے کس نے آگ جلا کر رکھی ہے

مدت گذری پیار میں کوئی انجم بن کر چمکا تھا
ایک کرن آنکھوں میں اُس کی میں نے چرا کر رکھی ہے

تسنیم عابدی
(امیٹھی)

اپنے ہی گھر میں کوئی اس طرح مہمان نہ ہو
یہ تماشہ میری رسوائی کا سامان نہ ہو

مجھ کو ہر دیپ محبّت کا بجھا دینا ہے
اس نئے طور پہ دل، دیدۂ حیران نہ ہو

میں نے اس واسطے آنکھوں کو جلا رکھا ہے
واپسی کے لئے رستہ کوئی ویران نہ ہو

بے وفائی میں ہے وہ طاق، مروّت مرا فن
روح کا زخم مرے جسم کا سرطان نہ ہو

میں اُسے چھوڑ کے تنہائی کا سودا کرلوں
کاش یہ فیصلہ میرے لئے آسان نہ ہو

وہ مرا پہلا قدم تھا مری نظروں کا فریب
کسی پیاسے کے مقدّر میں بیابان نہ ہو

قتل کرتا ہے مجھے میرے ہی ہتھیار سے وہ
تم سا دانا کوئی، اور مجھ سا بھی نادان نہ ہو

اپنے مستقبل سے دل گھبرا رہا ہے
کوئی غم اندر ہی اندر کھا رہا ہے

آج بارش کا بہت امکان ہے
چار جانب حبس بڑھتا جا رہا ہے

ہے خلاصہ داستانِ غم کا یہ !
دل مرا دھوکے پہ دھوکہ کھا رہا ہے

خال وخد پہچان سے قاصر ہوئے
ایک ملمّع مجھ پہ چڑھتا جا رہا ہے

سب حقیقت سامنے نظروں کے ہے
خوش گماں یہ دل مگر سمجھا رہا ہے

واہ رے نیرنگیٔ شام وسحر
چاہنے والوں سے دل گھبرا رہا ہے

میرے اندر تھا مرا دشمن چھپا
خانہ جنگی پہ جو اب پچھتا رہا ہے

جس شجر کی چھاؤں سے میں دُور ہوں
دُھوپ کی شدّت میں وہ یاد آ رہا ہے

تم سے کیا ترکِ تعلّق کا گلہ !
جُرمِ الفت کی سزا دل پا رہا ہے

کیا ملا صحرا نوردی سے ہمیں
اب یہی پچھتاوا ہم کو کھا رہا ہے

شیریں حسن

لوگ کتنے شاداں ہیں، خواہشوں کے میلے میں
ایک ہم کہ رہتے ہیں، درد کے جھمیلے میں

کتنی ماؤں کے ارماں، کتنی بیٹیوں کے شوق
بہہ گیا ہے کیا کیا کچھ، بارشوں کے ریلے میں

تیرے پاس آکر تو بات تک نہیں کرتی!
نام تیرا جپتی ہوں میں مگر اکیلے میں

سب پرانے منظر ہیں، کچھ نہیں بدل سکتا
عیب جو گرو میں تھا، آج ہے وہ چیلے میں

اب نہیں کوئی شیریں بے ستوں کی وادی میں
ہیر بھی نہیں ملتی، چاہتوں کے بیلے میں

آنکھ ڈبڈباتی ہے، درد مسکراتا ہے
شام جب ڈھلے تو پھر کون یاد آتا ہے

ریت کے گھروندے میں دیر تک بناتی ہو
بار بار اک ریلا آکے ان کو ڈھاتا ہے

اک صدا سی آتی ہے چاہتوں کی بستی سے
کوئی دل کا دروازہ روز کھٹکھٹاتا ہے

جب ہوا سنکتی ہے موتیوں کے پھولوں
میں یہی سمجھتی ہوں کوئی گیت گاتا ہے

چاندنی نکھرتی ہے یوں مرے خیالوں می
یاد کے افق پر جب چاند جگمگاتا ہے

سب پرانے قصے ہیں، بھول جا انھیں شی
کون کوہکن ہوگا، کون نہر لاتا ہے

امتیاز الحق امتیاز

واقفِ دردِ جاں، نرم ہاتھوں کا جادو روانہ کرو
رتجگوں کے عذابوں میں خوابوں کا دارو روانہ کرو

عمر بھر کی عبادت ریاضت مری ہو سکوں آشنا
وقت کی دوپہر میں مجھے شام با ہُو روانہ کرو

اس اندھیرے بدن میں کوئی حرف چمکے مجھے خط لکھو
میرے دل کی گذرگاہ پر کوئی جگنو روانہ کرو

خواہشِ گُل دہن پھر درونِ بدن سر اُٹھانے لگی
پھر اُسی لہجۂ پُر شگفتہ کی خوشبو روانہ کرو

میٹھی سرگوشیوں سے یہ جلتی ہوئی ریت ٹھنڈی پڑے
دشتِ بے درد میں کوئی ہمدرد آہو روانہ کرو

زندگی کی کرن خودکشی کی گلی میں نمودار ہو
خشک آنکھوں کی دہلیز پر کوئی آنسو روانہ کرو

اطہر قیوم راجہ

تیرا حال شاملِ حال ہے کہ نہیں ہے شاملِ حال بھی
اسی گومگو میں گزر گئے شب و روز بھی مہ و سال بھی
اسی واسطے میری زندگی رہی نارسائی کے قہر میں
نہ تو کج کیا سرِ بندگی نہ اُٹھایا دستِ سوال بھی
میں کہیں بسیط خلاؤں میں کہیں خوشبوؤں میں ہواؤں میں
مجھے لا سکے گا سرِ زمیں نہ تمہارا حسن و جمال بھی
وہ ہمارے ربط کا سلسلہ، خطِ زندگی میں اُلجھ گیا
کبھی خال خال تھا رابطہ، نہیں اب تو خواب و خیال بھی
کبھی رات کھا گئی سب نشاں جو جبینِ دشت پہ ثبت تھے
کہیں گردِ راہ میں کھو گئے مرے خوش خصال غزال بھی
وہی ایک بات جو اَن کہی، کہیں درمیان میں رہ گئی!
وہی ایک بات تھی گفتنی میری شاعری کا کمال بھی
جو بیانِ فردا و دی رہا کبھی میرے ہاتھ نہ آ سکا
وہی لمحہ حاصلِ زیست ہے کبھی یہ نہ آیا خیال بھی

اکرم عتیق

اک چمک ہر شے پہ تھی اور اک جوانی رات میں
چاند جب نکلا دسمبر کی سہانی رات میں

چاند کی تصویر تھی اور چاندنی کا عکس تھا
آئینہ سا بن گیا جھیلوں کا پانی رات میں

چاندنی، خوشبو، وہ ندیا کا کنارا اور ہم
کتنی دلکش بن گئی اپنی کہانی رات میں

چودھویں کا چاند تھا اور اُس کی سانسوں کی مہک
سارے رستوں پر تھی خوشبو کی روانی رات میں

وہ سماں مسحور کن سا، وہ معطّر سی فضا
کھو چلا ہے کیوں عتیق اب پھر پُرانی رات میں

نواز شاہد

خوشبو سانسوں میں بھر گیا کوئی
مجھ کو پاگل سا کر گیا کوئی

روشنی کی کرن کرن بن کر!
میرے دل میں اُتر گیا کوئی

خود پہ اُس کا گمان ہوتا ہے
جادو کیسا یہ کر گیا کوئی

وہ اجالوں کی دھوپ چھاؤں ہے
اپنے سائے سے ڈر گیا کوئی!

یہ ہواؤں کو کون بتلائے
خوشبو خوشبو بکھر گیا کوئی

کھڑکیاں تو کھلی رہیں شاہد
کیوں اچانک گذر گیا کوئی

آسناتھ کنول

یہ بھی اک رسم محبت کی نبھاتے جانا
ریت کے گھر ہی خیالوں میں بناتے جانا

خود فریبی بھی روایت ہے ہمارے دل کی
اپنی آنکھوں میں کئی زخم چھپاتے جانا!

چشمِ خوناب میں بکھرے ہوئے دکھ پڑھ لینا
وہ اگر پوچھے تو ہر پہلو بچاتے جانا

کوئی شکوہ، نہ شکایت نہ گلہ کرنا تم
دل کے ہر داغ کو چہرے پہ سجاتے جانا

نوکِ مژگاں پہ چمک اٹھیں ستارے بن کر
ان کنول نینوں میں کچھ چاند بساتے جانا

محمد حسین کنول

وقتِ رخصت مجھے مسرور نظر آتا ہے
دل کو دیکھے کوئی رنجور نظر آتا ہے
اس کی آنکھوں میں بسے خواب ہیں ناکامی کے
چاند سا چہرہ ہے بے نور نظر آتا ہے
ماننا دل سے پڑا ترکِ تعلق کا پیام
وہ جو حالات سے مجبور نظر آتا ہے
شاخ جو کٹتی ہے، ہوتی ہے تنے سے باہر
سر بھی جھکتا ہے جو مغرور نظر آتا ہے
چاہِ گمنامی میں غرقاب ہے جو برسوں سے
حاسدوں کو وہی مشہور نظر آتا ہے
کتنا نزدیک رگِ جاں ہے کنولؔ اس کا خیال
آسمانوں سے بھی جو دور نظر آتا ہے

سفر نامہ
۱۹۸۴

جاں نواز کوچے

★―――――――――― رام لعل (بھارت)

۱۳ر جولائی ۱۹۸۴ء ــ آج شب میں کاشی وشوا ناتھ ایکسپریس سے دہلی کے لئے روانگی۔ وہاں سے ناروے جانا ہے۔ میری کتاب خواب خواب سفر کی افتتاحی تقریب میں شرکت کرنے کے لئے۔

اسٹیشن پر میری بیوی شکنتلا، بیٹے ونود (چھابڑا)، بہو رینو، پوتی دیپا، پوتے درپن اور چھوٹی بہن موتیا اور کئی لوگ الوداع کہنے آئے۔

۱۷ر جولائی ــــ ایروفلوٹ فلائیٹ نمبر ایس یو ۵۵۸ براستہ ماسکو۔ میرا نام ویٹنگ لسٹ میں تھا۔ رات ایک بجے او۔کے ہوسکا۔ میرا چھوٹا بھائی مدن اور بھتیجا راجیو الوداع کہنے ایئرپورٹ پر آئے۔ پرواز ٹھیک پونے دو بجے ہوئی۔ ماسکو دہلی سے چار ہزار کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ صبح ۸ بجے کے قریب وہاں پہنچوں گا۔ وہاں سے ایس یو ۲۱۱ نمبر کی فلائیٹ سات بجے کر پچپن پر ملے گی۔

آج ہی کی تاریخ میں صبح دس بجے ہوائی جہاز اوسلو میں اُترا۔ ائیر پورٹ پر سید مجاہد علی اور سعید انجم موجود تھے۔

۱۹ر جولائی ــــ وائی کنگ ریستوران (موجودہ نام سارہ ہوٹل) میں شام کی چائے۔ سید مجاہد علی، سعید انجم، مسعود منوّر اور ارشد بٹ کے ساتھ۔ ارشد بٹ پی پی پی کا کارکن تھا۔ ۱۹۸۲ء میں پی آئی اے کا جہاز اغوا کرلیا گیا اُسے بھی گرفتار کرلیا گیا تھا۔ لاہور جیل میں رکھا گیا۔ پھر ایک معاہدے کے تحت اُسے دمشق لے جاکر چھوڑا گیا۔

رات کا کھانا ایک چینی ہوٹل میں۔ سمندر کی سیر ایک بوٹ میں کی۔ اس پر جنوبی ہند کا ایک جوڑا ملا۔ ایک مستقل طور پر لنگر انداز جہاز میں ریستوران۔ سڑک پر ڈراما۔ خاصا مجمع تھا۔ ایک مداری تماشا دکھا رہا تھا۔ قریب سے ایک پاگل زور زور سے بولتا ہوا گزرا۔ دو شرابیوں نے ؛ وکرو نا طلب کئے۔ بولے شاعری سنائیں گے۔ لیکن داد پہلے دینی ہوگی دو آدمی زمین پر اپنے ہیٹ رکھے بھیک مانگ رہے تھے۔

۲۱ر جولائی ــــ ویڈیو کیسٹ پر پاکستان کی بنائی ہوئی 'BLOOD OF HUSAIN' فلم دیکھی۔ جس کے ہدایت کار جمیل دہلوی ہیں۔ سلیمان پیرزادہ بطور ہیرو ڈبل رول میں ہے۔ حسین کا رول مرتضیٰ حسین نے کیا ہے۔ فلم دیکھ کر آنسو نکل پڑے۔ یہ وہاں کی فوجی حکومت کی استبداد کے خلاف بھٹو نے جو ابتدا شروع کی تھی جوان کے پھانسی دیئے جانے کے

بعد لندن میں مکمل کی جاسکی۔

ریڈیو پر میرے سفرنامے "خواب خواب سفر" کی افتتاحی تقریب کا اعلان ہوا۔

۲۳ر جولائی ـــــ انڈر گراؤنڈ ریلوے میں راولپنڈی کی ایک لڑکی سیمہ سے ملاقات ـــ سانولی، گہرے سیاہ بال۔ میرے سامنے بیٹھی سیب کھا رہی تھی۔ اچھی لگی۔ اس نے بتایا۔ "شادی شدہ ہوں۔ ایک بچی بھی ہے۔ پہلے جاب کرتی تھی۔ اب بچی کی وجہ سے نہیں کر رہی ہوں۔ شوہر جاب کرتا ہے۔ ماں باپ بھی اوسلو میں رہتے ہیں۔ اپنا مکان ہے۔ نارویجین زبان سیکھ لی ہے۔ اس لئے یہاں رہنا اجنبی نہیں لگتا۔ لیکن ایک نہ ایک روز گھر ضرور لوٹنا ہے۔ یہ ملک خوبصورت تو ہے لیکن اپنے وطن جیسا نہیں اگرچہ اپنا ملک بھی اتنا خوبصورت ہرگز نہیں ہے لیکن اپنا تو ہے ـــ وہاں رشوت ستانی بہت زیادہ ہے۔ کوئی کام کرانا ہو سال بھر لگ جاتا ہے۔ لیکن ٹینشن یہاں بھی ہے۔ یہ امتیاز تنخواہوں کی سطح پر نہیں ہے۔ رنگ و نسل کا ہے ـــ وطن جاتی ہوں تو وہاں سے مذہبی کتابیں خرید کر لاتی ہوں۔ یہاں اُردو کے پاکستانی و ہندوستانی رسالے بھی مل جاتے ہیں۔ ویڈیو پر فلمیں بھی دیکھ لیتی ہوں لیکن اس کی کریز نہیں ہے۔

۲۴ر جولائی ـــــ آج سیّد مجاہد علی اور یاسمین کو خدا نے فرزند عطا کیا۔

۲۵ر جولائی ـــــ سعید انجم کے ساتھ نوتسک فلم اسٹوڈیو میں گیا۔ وہاں عالمی شہرت یافتہ فلم ڈائریکٹر اسین ہمارا منتظر تھا۔ اس کی بنائی ہوئی دو فلمیں دیکھیں ـــ "GRANDMA AND EIGHT CHILDREN" اور "دروازے بند ہوتے ہیں"۔ دوسری فلم کا اسکرپٹ سعید انجم نے لکھا ہے جو لاہور اور اوسلو میں فلمائی گئی تھی۔ یہ فلم عاصم صحرائی کی ایک نظم پر مبنی ہے۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد جو ہم نے اسٹوڈیو کی کینٹین میں گذارا دو فلمیں اور دیکھیں "THEY ARE KILLING THE HORSE" جسے کراچی کے مشتاق گزدر نے بنایا ہے۔ اسے بھی بھٹو کے زمانے میں سرکاری امداد ملنی شروع ہوئی تھی لیکن اس کی وفات کے بعد یہ مکمل کی گئی ہے۔ دوسری فلم کا نام تھا۔ "THE HUS WIVES" (گھریلو عورتیں) اس فلم کا تذکرہ میں نے اپنے سفرنامے "خواب خواب سفر میں ۱۹۷۸ء میں کیا تھا۔ اس کی ہدایت کار ایک خاتون انجا برین (ANJA BREIN) تھی۔ وہاں کے انفارمیشن آفیسر نے سارے اسٹوڈیو دکھائے۔ وہیں اوک لورگ سے ملاقات ہوئی جو فلم انڈسٹری کا سابق مینجنگ ڈائریکٹر تھا۔ اب ریٹائر ہے۔

شام کا کھانا سعید انجم کے گھر پر ـــ سیّد مجاہد علی، شگفتہ انور اور انور بھی وہیں پہنچ گئے۔ سعید انجم کی بیوی طلعت نے بہت اچھا کھانا بنایا تھا۔

۲۶ر جولائی ـــــ آج میرے پوتے کا جنم دن ہے۔ لکھنؤ فون ملایا۔ بیوی سے صرف ہیلو ہیلو ہو سکی۔ پھر فون ٹھپ ہو گیا۔

شام کو چار بجے سیّد مجاہد علی کے ساتھ آسکر سکے ہوس (اسپتال) میں یاسمین اور اس کے بچے کو دیکھنے کے لئے گیا۔ وہاں طلعت، شگفتہ اور یاسر بھی آگئے۔ دونوں خواتین کے ساتھ اوسلو میں پاکستانی خواتین کی ایک انجمن بنانے

سکے بارے میں گفتگو۔ مایوسی کا اظہار۔ مردوں کی اجازت کے بغیر وہ کہیں آجا نہیں سکتیں۔ خاص طور پر کسی ایسی انجمن میں جو انھیں آزادی کا درس دیتی ہے۔ روکاوٹ پردہ سسٹم ہے جو اگرچہ ناروے میں نہیں روا رکھا جاتا۔ لیکن ان میں مردوں کے ساتھ آزادی سے آنے جانے میں جھجک یقیناً محسوس ہوتی ہے۔ دو ایک پاکستانی خواتین اوسلو میں برقعے میں بھی نظر آئیں۔ کار میں بیٹھ کر شاپنگ کرنے گئی تھیں۔

شام سات بجے مجاہد کے ساتھ منک ریستوران میں کھانا۔ یہ ایک آرٹ گیلری کا حصہ ہے جو منک نامی آرٹسٹ کے نام پر کھولی گئی ہے۔ اس کی پینٹنگز بھی دیکھیں۔

۲۷ رجولائی ـــــ کنول نین بخشی سفیر ہند کے ساتھ ہندوستانی سفارت خانے میں ملاقات۔ وہ اردو، ہندی اور پنجابی ادب کے شیدائی نکلے۔ میرے افسانے پڑھ چکے تھے۔ بڑی گرم جوشی سے ملے۔ کراچی اور ڈنمارک میں بھی رہ چکے ہیں، جب انھوں نے سید مجاہد علی کو پنجاب کے بارے میں ہندوستانی اخبارات کے تراشوں کے فوٹو اسٹیٹ اور ایک ویڈیو کیسٹ دیا تو میں نے ان کے سامنے سفارت خانے میں ایک لائبریری کھولنے کی تجویز رکھی جس میں ہندوستان کی خاص خاص زبانوں کی کتابیں رکھی جائیں اور ناروے میں مقیم لوگوں کو پڑھنے کے لئے دی جایا کریں۔ میری تجویز انھوں نے قبول کرلی۔ اور ہندوستان کے اردو ناشرین کے ساتھ ان کا رابطہ قائم کرا دینے کے لئے کہا۔

پشاور کے پختون طاہر خان کے ساتھ سارا ہوٹل میں ملاقات۔ وہ نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کا رکن ہے۔ اس نے کہا۔ "ناروے میں ہمارا حشر کہیں ریڈ انڈینز جیسا نہ ہو! ہندوستان اور افغانستان دونوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔"

اس نے مجھے خان عبدالغفار خان (سرحدی گاندھی) کے کئی پکچر پوسٹ کارڈ دیئے۔

۲۸ رجولائی ـــــ "خواب خواب سفر" یورپ کے بارے میں میرا سفرنامہ جو ۱۹۸۳ء میں ہندوستان سے شائع ہوا۔ اس کی تعارفی تقریب ناروے کی راجدھانی اوسلو میں اس لئے منائی گئی کہ اس کا بیشتر حصہ ناروے میں مقیم ہندوستانی و پاکستانی تارکین وطن کے مسائل کے بارے میں ہے۔ اس کی صدارت کوپن ہاگن (ڈنمارک) کے سفیر رضی صدیقی نے کی ان سے میری پرانی رسم و راہ تھی۔ جب وہ سنگِ میل پشاور کے رسالہ تشکیل کے ادارتی ادارے میں شامل تھے۔ محمد علی صدیقی کے قریبی عزیز ہیں۔ سید مجاہد علی نے انھیں بطور خاص مدعو کیا تھا۔ ہم دونوں اپنے اپنے وطن سے ہزاروں میل دور پہلی بار ملے۔ وطن کی یادیں تازہ ہوئیں تو دونوں آب دیدہ ہوگئے۔ پچھتر کی تعداد میں سامعین میں صرف تین ہندوستانی تھے۔ ہندوستانی سفارت کار اشوک تومر، چاولہ اور مسز چاولہ۔ باقی سب پاکستان کے لوگ تھے۔ سید مجاہد علی نے انڈو پاک فرینڈشپ کے لئے ایک اچھا قدم اٹھایا۔ سعید انجم۔ انیس احمد اور مسعود منور نے مقالے پڑھے۔

ایک جگہ دیوار پر یہ نعرہ لکھا ہوا نظر آیا۔

"VART FRAMTID SVART" یعنی ہمارا مستقبل تاریک ہے۔

۲۹ رجولائی ـــــ ایک اسکول میں ادبی سنگت کی ادبی نشست۔ میں نے صدارت کی اور افسانہ چاپ سنایا۔ سعید انجم، ارشد اقبال، محمد اختر، شاہدہ وسیم اور ونود پاسی نے بھی افسانے سنائے۔ سریش شکلا سے وہیں ملاقات ہوئی۔

جو لکھنؤ کا ہے اور اوسلو سے ماہنامہ "پرچھے" (تعارف) نکالتا ہے۔

۳۰ر جولائی —— لاہور کے تنویر اسلم اور ڈاکٹر شہزاد کے ہاں کھانے کی دعوت — رضی صدیقی، سید مجاہد علی اور سعید انجم بھی شریک ہوئے۔ رضی صدیقی نے سعادت حسن منٹو کے بارے میں دو اہم واقعات سنائے۔

(۱) منٹو نے ہلال اخبار میں اپنے خلاف ایک خط چھپوانے پر اصرار کیا تھا۔ تاکہ اسے صحت یاب ہونے کا سارٹیفکیٹ مل جائے۔

(۲) منٹو نے رضی صدیقی سے سرراہ پانچ روپے مانگے۔ رضی نے اُسے دس روپے دے دیئے دوسری بار وہ اس کے آفس میں آیا۔ اور اس نے بتایا کہ اب وہ اسپرٹ اور مٹھّا ملا کر پینے لگا ہے۔ رضی آج تک متاسف ہے کہ اس نے منٹو کو دوسری بار دس روپے کیوں دے دیئے تھے۔ کیونکہ اس کے بعد اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔

رضی صدیقی کا ایک ذاتی واقعہ —— جب وہ ایک اخبار میں کام ...... کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ لیکن اخبار کے ایڈیٹر نے اُسے دس روپے بطور معاوضہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اُس کا کہنا تھا۔ میں نے صحافیوں کے لئے کوئی تربیت گاہ نہیں کھول رکھی ہے۔ جب رضی صدیقی اعلےٰ عہدے پر فائز ہوا تو وہی ایڈیٹر اس کے پیچھے پیچھے گھومنے لگا۔ اُسے تنخواہ دینے کے لئے لیکن رضی نے لینے سے انکار کر دیا۔

۳۱ر جولائی —— اوسلو کے نارویجین زبان کے اخبار آربائیدر بلادے کے کلچرل ایڈیٹر کھال پر سے ملاقات۔ وہ میرے سفرنامے کے کچھ باب اپنے اخبار میں ترجمہ کرا کے چھاپنا چاہتا تھا۔ ۳ر اگست کو گیارہ بجے ان کے اخبار کی نمائندہ ٹولی لارسن مجھ سے انٹرویو لے گی۔

۱ر اگست —— اوسلو شہر کی ایک دیوار پر لکھا تھا۔ SVARTEFAN (سوارٹے فان) یعنی کالے شیطان یا گندے کالے لوگ!

رات دس بج کر پینتیس منٹ پر بذریعہ ریل کوپن ہیگن کے لئے روانگی۔ اسٹیشن پر سید مجاہد علی، سعید انجم، انیس احمد، علی اصغر شاہد اور ظہور احمد الوداع کہنے کے لئے آئے۔ ظہور یوکرین (سوویت روس) میں ڈاکٹری پڑھ رہا ہے۔

۱۱ر اگست —— کوپن ہیگن کے ریلوے اسٹیشن پر جمشید خان ملیں گے۔ جن سے لکھنؤ میں میرے مکان پر ایک ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ سوئٹزرلینڈ میں مقیم ہیں۔ ان کا حقیقی وطن ملتان ہے۔ وہ مجھے اپنی کار میں جینوا لے جائیں گے۔ وہاں پہنچتے ہی فرانس کا ٹرانزٹ ویزا لینا ہے۔ اور لندن جانے کے لئے ۲۰ – ۱۹ر اگست کی درمیانی شب میں بذریعہ ریل ریزرویشن بھی کرانا ہے۔

کوپن ہیگن کی جانب رواں ٹرین میں سنگاپور کے ایک ٹیچر اور کناڈا میں اقتصادیات پڑھانے والے آندھرا کے ایک پروفیسر سے ملاقات۔ باتوں میں سفر اچھا کٹا۔ ریلوے اسٹیشن پر جمشید خان اور نذیر احمد خان موجود تھے۔ نذیر بھی ملتان کے ہیں۔ دونوں کے ساتھ سرائیکی میں گفتگو کرنا اچھا لگا۔ وہ اپنے گھر لے گئے۔ نذیر کی بیگم بھی ملتانی ہیں۔ جبکہ جمشید کی بیوی

لکھنؤ کی ہے۔ نذیر کے گھر پر ایک بھیڑ سی لگی۔ نذیر کے بیٹے فہیم، نعیم اور وسیم اور بیٹی شمسہ اور وسیم کی بیوی شہناز، ان کے دو چھوٹے بچے منی اور میمونہ، شمسہ کا شوہر جمی اور ان کا بیٹا بوبی۔ جمشید کی بیوی شہانہ اور ان کے دو بچے شاہ زیب اور شعیب۔ رضی صدیقی بھی آ گئے۔ ان کی بیگم پیکنگ میں مصروف تھیں۔ وہ لوگ اب پاکستان جانے والے ہیں۔

مسٹر نذیر احمد نے حلوہ اور پوری سے ناشتہ کرایا۔ اس کے بعد میں نذیر، جمشید اور رضی صدیقی کے ساتھ کوپن ہیگن کے پارک اور شاپنگ سنٹر دیکھنے کے لئے نکل پڑا۔ ایک پارک میں کئی درجن ننگ دھڑنگ مرد و عورتیں غسل آفتاب کرتے ہوئے۔

دوپہر کا کھانا ایک پاکستانی ہوٹل شیراز میں جہاں تندوری روٹی، گوشت اور لسی سے بھرے ہوئے جگ مل گئے۔ اس کے سامنے ایک اور اسلامی ہوٹل کا سائن بورڈ لگا دیکھا۔ وہیں آس پاس کئی جنسی آلات کی دکانیں۔ اور ان کے عقب میں کوچہ گرد لڑکیوں کے ہجوم،

شام کو قیام گاہ پر لوٹ کر پاکستان کی بنائی ہوئی پنجابی فلم "نوکر ووہٹی دا" ویڈیو پر دیکھی، اچھی لگی۔ آدھی رات کو بی بی سی سے خبریں سنیں۔ پاکستان نے ہاکی کا ورلڈ کپ جیت لیا۔ سب کو مبارک باد دی۔

۱۲ اگست ـــــ صبح نو بجے جمشید اور شہانہ اور ان کے دو بچوں کے ساتھ بذریعہ کار سوئٹزرلینڈ کے لئے روانگی۔ ایک فیری کے ذریعے جرمنی میں داخل ہوئے۔ PUTTGARGEN جرمنی کی پورٹ۔ ویزا کی چیکنگ۔ روڈبی 'RODBY' پر مکھیوں کا حملہ۔ گاڑی کے سارے شیشے چڑھا لئے۔ شام ساڑھے چھ بجے GOTTINGEN مقام پر گاڑی میں پیٹرول بھروایا گیا۔ ونڈ اسکرین صاف کرایا گیا۔ یہ مغربی جرمنی کا ایک شہر ہے جہاں جرمنی کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔ سمندری جہاز کے عرشے پر شہانہ کے ساتھ سوئٹزرلینڈ کی عورتوں اور عام طور پر وہاں کے مردوں اور عورتوں کی آزادی کے بارے میں گفتگو۔ اس نے کہا۔ مجھے سڑکوں پر آزادانہ بوسہ بازی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ جمشید نے اپنی داستان حیات سنائی۔ وہ پشاور اور کابل کے راستے سے کیسے یہاں پہنچا تھا۔

۱۳ اگست ـــــ رات کو فرینکفرٹ میں کوئی ہوٹل خالی نہیں ملا۔ وہاں اٹھارہ کیلومیٹر دور شہر سے باہر ایک قصبہ مورفیلڈن (MORFELDEN) کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں قیام۔

وہاں سے صبح ساڑھے نو بجے آگے روانہ ہوئے۔ دریا رائن اس علاقے کا سب سے بڑا دریا ہے۔ گنگا کی طرح۔ اس میں کشتی بانی ہوتی ہے۔ دوسرے ملکوں کو جانے کا ایک ذریعہ ہے۔ تیل کی باربرداری اسی دریا کے ذریعے ہوتی ہے۔

فرینک فرٹ ریلوے اسٹیشن بہت ہی خوبصورت ہے۔ کلکتہ سے بھی بڑا ہے۔ اس کے ۲۳۔ پلیٹ فارم ہیں۔ بے شمار پبلک فون بوتھ اور بک اسٹال دیکھے۔ ڈاک خانہ اور سامان سے بھرے ہوئے اسٹور۔ میں نے اپنے بیٹے کو ایک پکچر کارڈ پوسٹ کیا۔ شہانہ نے پاکستان کے عزیزوں کو چھ کارڈ بھجوائے۔ (جاری)

سیکس کرنسی

ڈاکٹر سلیم اختر

"لخلخہ"

نیویارک میں فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اگر پچیس ڈالر کا نوٹ نظر آئے تو آپ کیا کریں گے؟ ایک مرتبہ تو ٹھٹھک جائیں گے نا؟ بس اسی طرح میں ٹھٹھک گیا کہ میرے سامنے پانچ، دس، پچیس، پچاس اور سو سو ڈالر کے کئی نوٹ بکھرے تھے۔ ہائیں! یہاں کیا ڈالروں کی بارش ہوئی ہے؟ ظاہر ہے کہ کرنسی رین کہیں بھی نہیں ہوتی. خواہ وہ امریکہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ کم از کم کوئی راہگیر اور زیادہ سے زیادہ کوئی بنک لوٹا گیا ہے. میں نے فوراً فی ڈالر پچیس روپے ضرب دے کر حاصل ضرب کو خطیر رقم کی صورت میں بکھرے پایا تو خزاں رسیدہ پتوں کی مانند اڑنے اور بکھرنے سے پیشتر انھیں سمیٹ لیا۔ مگر انھیں دیکھ کر جو میں ٹھٹھکا تو سمجھئے کہ اب تک ٹھٹھکا ہوا ہوں۔

قارئین باتمکین! یہ سیکس کرنسی تھی۔ یعنی طوائفوں کے اشتہارات ہر نوٹ پر، فسانہ عجائب جیسے مرصع اسلوب میں طوائف نے اپنی خصوصیات بیان کرنے کے بعد ہوشربا قسم کی تصویر بھی دے رکھی تھی۔ مبادا کوئی بھولا بادشاہ مغالطہ میں نہ مارا جائے۔ عرض مدعا کے لئے ٹیلی فون نمبر بھی درج تھا تاکہ آپ مزید نوٹ لے جاکر یہ نوٹ کیش کرانے کے لئے در حسن پر قدم رنجہ فرمائیں۔

ایسے نوٹ دو ہی رد عمل پیدا کر سکتے ہیں۔

۱۔ قریبی ٹیلی فون بوتھ کی جانب بھاگنا۔

۲۔ لاحول ولا کہہ کر ان کے پرزے پرزے کر دینا.

مگر میں نے نوٹ پرزے پرزے کر دینے کے برعکس انھیں احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ لاہور واپسی کے بعد میرے سفر کی یہ سب سے زیادہ سنسنی خیز سوغات ثابت ہوئے، جو دوست خفیہ سفر نامہ لینے گھر آیا۔ اسے یہ نوٹ لخلخہ کی مانند سونگھا دیتا اور پھر ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کا عالم ہوتا۔ میں تو سفر نامہ کے ساتھ نمونۂ کلام بھی شائع کرانے کو تیار ہوں۔ لیکن۔"

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے!

"ہل من مزید ..... !"

سُنا ہے کسی زمانہ میں نیویارک کسبیوں سے اٹا پڑا تھا. چنانچہ گلیوں سڑکوں پارکوں اور ایسے ہی مقامات پر دعوتِ عام دی جاتی تھی. اس کارِخیر میں پولیس اور کرائم لارڈز کا تعاون بھی شامل ہوتا تھا. اگرچہ سختی کی وجہ سے اب یہ سلسلہ عام تو نہیں لیکن کاروبار تو بہرحال کاروبار ہے. وقتی تعطل ہو سکتا ہے مگر قطعی طور پر بند نہیں ہو سکتا. لہٰذا اب تزئین کے نئے نئے ڈھنگ ایجاد کئے جاتے ہیں. مثلاً وین میں بیڈ روم اور بیڈ فیلو مہیا کیا جاتا ہے. آپ لفٹ لے کر وین میں سوار ہو جایئے اور یہ ہموار رفتار سے محوِ سفر رہے گی. یہ صحیح معنوں میں AUTO EROTISM ہے. ایک اور مہذب طریقہ ایسکورٹ سروس (ESCORT SERVICE) کا ہے. ان کے باقاعدہ اشتہارات چھپتے ہیں. ٹیکنیکلی تو یہ سیاحوں، مسافروں اور غیرملکیوں کو گائیڈ اور جلیس مہیا کرتے ہیں. لیکن درحقیقت یہ بھی کال گرلز ہی کو رنگ ہوتی ہے. اگر آپ کو کتاب "MAYFLOWER MADAM" مل سکے تو ضرور پڑھئے ـ آنکھیں کھل جائیں گی کہ کس سائنٹفک انداز سے جسم فروشی کی جاتی ہے. جب یہ سب کچھ منظرِ عام پر آیا تو تمام امریکہ میں جہاں ہاہاکار مچ گئی. وہاں وال سٹریٹ جرنل نے ایسکورٹ سروس کی کاروباری سوجھ بوجھ اور تاجرانہ مہارت کی تعریف میں اداریہ قلم بند کیا.

یہ اور اسی انداز و اسلوب کے متعدد طریقے اور پھر ان سب پر مستزاد پانچ سو ڈالر فی گھنٹہ کی مہنگی کال گرل سے لے کر دس ڈالر کے کوئیک سٹینڈ تک ہر نوع کی فلیش پیڈ لنگ ہوتی ہے. معالجین اور معلمینِ اخلاق لاکھ ایڈز ایڈز چلاتے رہیں، مگر پیٹ کی آگ اور جسم کی آگ کبھی سرد نہیں ہوتی. اس لحاظ سے تو نیویارک واقعی ایک بہت بڑا تنور ہے جو ہر وقت ایندھن کے لئے چلاتا رہتا ہے۔ ھَل مِن مزید !

۴۲ سٹریٹ

ففتھ ایوینیو، وال سٹریٹ، براڈوے کی مانند بیالیس سٹریٹ کی بھی خصوصی شہرت ہے. کہ یہاں کاروبار جنس ہوتا ہے. یہ طوائفوں کا نہیں بلکہ تعلقاتِ جنس کا مرکز ہے. یہاں سے گزریں تو ترغیبِ گناہ والی ایسی کوئی بات نظر نہ آئے گی. یہ بھی عام سڑکوں جیسی ایک سڑک ہے اور دوکانیں بھی عام دوکانوں جیسی ہی ہیں. جیسے گروسری بک رہی ہو، کتابیں ہوں یا پھر ملبوسات! مگر یہ بھی ہیں اور بھی بہت کچھ!

میں ایک پورنو شاپ میں داخل ہوتا ہوں، ہر رنگ، قوم اور نسل کی عورتوں پر مشتمل نیوڈ میگزین ـــ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ناروے، سویڈن اور اٹالین لڑکیوں کے ساتھ جاپانی، کورین اور فلپینی پیلو بیوٹیوں کے ساتھ بھارت کی سلونی ناریوں والے میگزین کی بھی کمی نہ تھی. اور پھر یہ خاصے سستے بھی تھے. مثلاً ایک برگر کی قیمت میں!

کسیلے بدن تیغ کی دھار جیسے

لہو رس میں گوندھے ہوئے جسم، ریشم کے انبار جیسے

تخلیق

نگر جن پہ پھسلے وہ شانے، وہ باہیں

مدوّر اٹھانیں، منور ڈھلانیں (مجیدؔ امجد)

ایک جانب نیلی فلموں سے شیلف بھرے بھرے، ۱۵ ڈالر میں ایک چالیس میں تین، ایک ظالم نے تو ان کی کلیرنس سیل بھی لگا رکھی تھی۔ میں نے تھوک کے بھاؤ میں کوئی درجن بھر کیسٹ خریدنے کا سوچا بھی، بلکہ ذہن نے ان درجن بھر عزیز دوستوں کی فہرست بھی مرتب کر لی، جو یہ تحفہ پا کر بے حد خوش ہوتے، مگر لاہور ائیرپورٹ پر چیکنگ کے خوف سے باز رہا۔ اگر پکڑا گیا تو اگلی صبح کچھ اس قسم کی سرخیاں اخبارات میں چھپیں گی!

بلیو پرنٹ سکنڈل میں گورنمنٹ کالج کا پروفیسر گرفتار

نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر بلیو فلمیں سمگل کرتے پکڑا گیا۔

افسوس مجھے گرین چینل یاد ہی نہ رہا۔

ایک الماری میں وہ تمام آلات سج رہے تھے جن کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا، مگر درشن کا موقع نہ ملا تھا۔

PEEP SHOW صرف پچیس ۲۵ سینٹ میں اور LIVE SHOW محض ایک ڈالر میں۔ چہ ارزاں فروختند!

مجھے PEEP SHOW کے بارے میں جانکاری تھی مگر ۲۵ سینٹ کا یہ جنسی تماشا مجھے بہت ہی گھٹیا معلوم ہوا۔ اور میں خود کو اس سطح تک گرانے کو تیار نہ تھا۔ جو معصوم حضرات اس کے بارے میں نہیں جانتے وہ اپنے بچپن کا وہ شخص یاد کریں، جو سر پر ایک کھوکھا سا اٹھائے آواز لگاتا تھا۔ آگرہ کا تاج محل دیکھو، کلکتے کی کالی مائی دیکھو، نومتی کی دھوبن دیکھو — سب بچہ لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ اور ایک ایک پیسہ دے کر "روشن دان" سے آگرہ کا تاج محل، اور نومتی کی دھوبن دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ بس اسی انداز و اسلوب کا PEEP SHOW ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دھوبن کی جگہ دھوبن کا گھاٹ ہوتا ہے۔ آپ ٹوکن ڈالتے ہیں —

سامنے اک
جگ مگ جسم
گرتی مڑتی لوٹ کر جڑتی، مرمر کی ڈھلوان
لب، کچھ قاشیں، رگیں، نخلے، ماس، مسام،
سب کچھ ایک تھرکتے بہتے عکس کا جزو،
سب کچھ جسم کی باغی سلطنتوں کی ایک عجیب دنیا،
گول مٹول کرّے، انمول زمینیں، ساحل، جھرنے، دھوپ،
چاندنی، مخمل، پھول (مجید امجد)

"حلال گوشت"

میرا خیال تھا کہ یہ پُر ہجوم بازار اور مصروف دوکانیں ہوں گی مگر اس کے برعکس منظر دیکھا۔ میری ہی عمر کے ایک اور بزرگ گوا ہچے گوا ہچے سے دکھائی دیتے۔ کاؤنٹر پر ایک کالا۔ کالا کیا بہت ہی کالا۔ بڑا جاپانی تھا۔ اور ہم دو بالیوں سے قطعی طور پر لاتعلق۔ یہاں آکر اندازہ ہوا کہ ہم جو کے جن چیزوں پہ جان دیتے ہیں۔ ان کی یہاں کوئی اہمیت نہیں اور یہ تمام نیلا کاروبار، زیادہ تر غیر ملکی سیّاحوں یا پھر ناکردہ کار بالیوں کے دم قدم سے ہے۔ تمام دوکانیں جھانکیں اور بیشتر کو گاہکوں سے خالی پایا۔

دو کالی عورتیں اندر داخل ہوتی ہیں۔ وہ کاؤنٹر والے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہیں۔ ایک ذرا پختہ عمر کی تھی۔ مگر دوسری تو نوجوان تھی۔ یہ غالباً انڈر ٹریننگ ہے۔ میں نے اندازہ لگایا۔

میں LIVE SHOW کے لئے ایک ڈالر دیتا ہوں۔ کالا ٹوکن دے کر اُوپر سیڑھیاں چڑھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک کالا جن گویا آدم بو! آدم بو!! کہہ کر استقبال کرتا ہے۔ کچھ دیر بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آدم بو نہیں کہہ رہا تھا۔ بلکہ مجھ سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ مگر میرے پلّے اس کی بات نہ پڑ رہی تھی۔ اتنے میں دو کالی عورتیں، سیاہ جلد کی زیادہ سے زیادہ نمائش کرتی ہوئی آجاتی ہیں۔ وہ ہنسی ہنس کر گویا مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ کالا جن ہاتھ ہلا ہلا کر زور زور سے کچھ کہہ رہا ہے:

میں نے اچانک خوف کی سرد لہر کو ریڑھ کی ہڈی پر محسوس کیا۔ اور ساتھ ہی خون کا دباؤ بڑھتا پایا۔ LIVE SHOW کا مطلب وہ نہ تھا جو میں سمجھا تھا۔ میں ریلنگ کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہوں۔ کالی عورتیں کچھ سمجھا رہی ہیں جو میں سمجھتے ہوئے بھی نہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرے اعصاب پکار رہے ہیں! SOS! SOS! SOS۔ ان کے جسم ڈرا رہے ہیں۔ ایڈز! ایڈز!

میں خاموشی سے سیڑھیاں اُترتا ہوں!

باہر معمولی ٹریفک ہے۔ فٹ پاتھ پر راہگیروں کا ہجوم ہے۔

ایک پاکستانی گوجرانوالہ کی پنجابی نما انگریزی میں گزرنے والوں کو چلّا چلّا کر بتا رہا ہے۔

"LIVE GIRL SHOW"! "LIVE GIRL SHOW"!!

ہم دونوں کا رنگ باہمی تعارف کا ذریعہ ہے، میں قریب جا کر اس سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ عفیفہ ماں اور معصوم بہنوں کے بھائی تو کن لڑکیوں کا اشتہار بنا ہوا ہے۔ میں اس کی طرف ایک قدم بڑھاتا ہوں۔ وہ مجھے دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہا۔ صرف زبان گردان کر رہی ہے۔

"LIVE GIRL SHOW! "LIVE GIRL SHOW"!!

اس پاکستانی سے تھوڑا آگے ایک کالا لڑکا رنگین ننگی تصویریں بانٹ رہا ہے۔ مگر بیشتر راہ گیر یہ لینے سے گریزاں نظر آتے۔ جن دو چار کے ہاتھ میں اس نے زبردستی تھمائیں بھی انھوں نے ایک نظر ڈال کر انھیں پھینک دیا۔ میں تصویریں لینے لگا تو معاً ذہن میں آیا کہ میری بھابی نے اگر یہ میرے پاس دیکھ لیں تو اپنے جیٹھ کے بارے میں وہ کیا رائے قائم کرے گی۔

چند قدم آگے ایک سفید نوجوان لڑکی — کہ بذاتِ خود ایک اشتہار تھی۔ اشتہارات تقسیم کر رہی تھی۔ نہ جانے کس شے کے؟ — نظر اٹھائی تو کونے پر ایک پاکستانی کے ہوٹل پر حلال گوشت کا بورڈ دکھائی دیا۔

میں چوک میں آ کر ایک طویل سانس لیتا ہوں!

سُرخ لباس میں ملبوس ایک شخص بجوکر بنا STILTS پر چڑھا اشتہارات تقسیم کرتا دکھائی دیا۔ لگتا ہے آج تمام نیویارک میں اشتہارات ہی تقسیم ہوں گے۔

فٹ پاتھ پر، سیڑھیوں پر، ٹھیلوں پر، خوانچوں پر چیزیں بک رہی ہیں۔ ٹی شرٹس، سوفٹ ڈرنکس، ہاٹ ڈوگز، سینڈوچز — برگر، پیزا — ایک طرف امریکیوں کے پسندیدہ کھیل باؤلنگ کی جگہ نظر آتی ہے۔ داخلہ ۱۲ ڈالر، پارکنگ لاٹ۔ پہلے گھنٹے کے ۱۰ ڈالر۔

لوگ چل پھر رہے ہیں۔ کام میں مصروف ہیں۔ اپنے معمولات میں منہمک ۴۲ سٹریٹ کے پڑوس سے لاتعلق!

افراطِ زن

۴۲ - سٹریٹ جنس کا ایک پہلو ہے۔ اور خاصا گھناؤنا بھی — لیکن جنس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اب اسے اتنا عام بنا دیا گیا ہے کہ اس کی POPCORN کھانے سے زیادہ اہمیت نہیں رہی۔ جب عورتیں نیکر، شارٹ، ٹی شرٹ بلکہ صرف بریزر میں دیکھنے کو ملیں اور بکنی کے ساتھ ساتھ ٹاپ لیس اور باٹم لیس مشاہدات بھی شامل کر لینے پر صورت یہ بنتی ہے کہ ہم جیسے بھوکے اور ندیدے پاکستانیوں کا بھی چند دن بعد جی اُوبھ جاتا ہے۔ آخر مرد کب تک پنڈلیوں اور رانوں کو دیکھ دیکھ کر جی ہلکان کر سکتا ہے۔

ہم افراطِ زر کے اقتصادی مسائل کی دلدل میں دھنسے ہیں تو وہ افراطِ زن کے پیدا کردہ معاشرتی مسائل کے بھنور میں گھرے ہیں۔ افراطِ زن کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک تخمینہ کے مطابق صرف نیویارک شہر میں پانچ دس لاکھ تنہا عورتیں زندگی بسر کر رہی ہیں — یہ سب کیا کرتی ہوں گی؟ ظاہر ہے ٹیلی ویژن تو جیون ساتھی نہیں بن سکتا۔ بقدرِ ظرف نہیں ہے یہ....

اِدھر امریکہ کی تیز رفتار زندگی میں گھر میں گھسے رہنے کا تصور ہی نہیں اس لئے ڈیٹنگ ضروری تو اس کے بعد کے منطقی واقعات لازم ہیں۔ یوں CASUAL SEX کے رویے نے فروغ پایا۔ جس میں نقصان سراسر عورت ہی کا ہوتا ہے۔ اگرچہ "گولی" نے بڑی حد تک عورت کو حمل کے خوف سے نجات دلا دی ہے۔ تاہم آنے والے ننھے مہمان کو کون روک سکتا ہے۔ خواہ وہ بن بلایا ہی کیوں نہ ہو! اس لئے اب بے نکاحی ماؤں اور بے باپ بچوں کی ایک معقول تعداد بھی مل جاتی ہے۔

یہ درست ہے کہ جنسی تعلقات / محبت اور شادی پر بھی منتج ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ نہیں۔ ریپ کے بہت سے واقعات بھی محض اس لئے وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ بلا جھجک ملنا جلنا یا اپنے بوائے فرینڈ کو صحیح معنوں میں پرکھے بغیر ہی وہ اسے بے تکلف ہونے کی اجازت دے دیتی ہے۔

جنس — ٹیلی ویژن سٹائل

افراطِ جنس کا ایک بڑا سبب ٹیلی ویژن اور کمرشل سیکس بھی ہے۔ ہمارے ٹیلی ویژن پر کوکا کولا کے اشتہار میں ہوائی جہاز سے چھلانگ لگتے ہیں۔ جبکہ امریکہ میں بکنی پوش جوانیاں آپ کی پیاس بھڑکاتی ہیں، یہی نہیں بلکہ اخبارات جرائد وغیرہ کے اشتہارات بھی بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر جنس کا سہارا لیتے ہیں۔

ٹیلی ویژن کے اشتہارات میں سے جو دو اشتہار مجھے اچھے لگے آپ بھی سن لیجئے۔ ایک خوبصورت لڑکی بریتھ فریشنر فروخت کر رہی ہے۔ جب وہ نوجوان گاہک کو خریدنے کے لئے مائل کرتی ہے تو وہ اس کا منہ چوم کر بریتھ فریشنر کا عملی ثبوت حاصل کرتا ہے!

— ایک اور اشتہار!

چھوٹا لڑکا کچھ کھا رہا ہے چھوٹی لڑکی اس سے مانگ رہی ہے اور اس کے انکار پر لالچ دے رہی ہے اگر مجھے یہ کھانے کو دے دو تو میں تمہیں فلاں چیز دے دوں گی۔ مگر وہ پھر بھی نہیں مانتا۔ تو وہ اپنی دانست میں اسے بڑے انعام کی پیشکش کرتی ہے۔ "I WILL GIVE YOU A BIG KISS!"

لڑکا برا سا منہ بنا کر پلیٹ چھوڑ دیتا ہے

میری موجودگی میں وہاں جنس کے حوالے سے ایک عجیب طرح کی بحث کا آغاز ہوا۔ ہوا یہ کہ مشہور جریدہ "VANITY FAIR" نے اپنے سرورق پر ایک ایکٹریس ڈیمی مور کی حمل سے خاصے پھولے ہوئے پیٹ والی بے لباس تصویر شائع کر دی۔ پرچہ چھپتے ہی درِ نزاع باز ہو گیا۔ عریاں حاملہ کی تصویر کی اشاعت درست ہے یا غلط۔ اس بحث میں عورتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ میں نے بطورِ خاص یہ تصویر دیکھی مگر سچی بات تو یہ ہے کہ کسی طرح کے جنسی تھرل کے برعکس خاصی کراہت کا احساس ہوا۔

لطیفہ یہ ہے کہ عریانی اور فحاشی کے بارے میں مختلف ریاستوں کے اپنے اپنے قوانین ہیں۔ چنانچہ نیویارک سٹیٹ میں تو پرچہ فروخت ہوا، چند بعض اور ریاستوں میں حمل سنسر ہو گیا۔

سنسر سے یاد آیا کہ وہاں بھی ٹیلی ویژن اتنا آزاد نہیں جتنا ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے وہاں سنسر کا وہ "چیک" دیکھا جس سے PTV والوں نے ہمیں روشناس کرایا ہے۔ نیویارک کے سنٹرل پارک میں شیکسپیئر کے مشہور ڈرامہ "AMIDSUMMER NIGHT DREAM" کا شو ہو رہا تھا، لیکن بالکل عریاں! اس ڈرامے کا پریس میں خاصا چرچا تھا۔ ٹیلی ویژن پر اس ڈرامہ کی خبر دیتے ہوئے ریہرسل کے نیوڈ شاٹس سنسر کر دیئے گئے۔ اسی طرح فیچر فلموں میں بے لباسی کے مناظر کو "چیک" پہنا دیا گیا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ امریکی اس طرح مادر پدر آزاد نہیں جس طرح ہم انہیں سمجھتے ہیں اور میڈیا کی کچھ نہ کچھ اخلاقیات ہیں — لہٰذا وہاں نئی چیز نو عریانی دیکھی (شاید عورتوں کی خاطر) یعنی مردوں کے مکمل عریاں مناظر کے بیک شاٹس۔ غالباً فرنٹ شاٹس پر خود ہیرو کو بھی اعتراض ہو گا۔

"جنس کی کافی"

ٹیلی ویژن پر "کنکشن" پروگرام بڑا دلچسپ لگا۔ اس پروگرام میں ٹیلی ویژن والے انجان مرد اور عورت کو متعارف کرا کر اپنے خرچ پر شام بسری کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ کمپیئر اور سامعین کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ کون کس کا ساتھی بنے گا۔ اس کا تصفیہ کمپیوٹر کرتا ہے۔ میزبان اور سامعین کے سوالات تیز اور چبھتے ہوتے ہیں۔ جبکہ جوابات بے جھجک اور بے تکلفانہ جن سے اندازہ ہوا کہ بعض جوڑے تو پہلی ملاقات ہی میں ایک دوسرے کا جوڑ ثابت ہوتے ہیں۔ پروگرام کیا ہے اچھا خاصا جنسی مدرسہ ہے۔

اس پروگرام میں آنے والی دو مرتبہ طلاق یافتہ ۵۳ سالہ ویٹرس نے بڑی بے تکلفی سے بتایا کہ وہ آزاد جنسی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ہوٹل میں ملازمت کی وجہ سے ہمیشہ نئے نئے مرد ملتے رہتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ جب کوئی مرد مجھے اچھا لگے تو اس کی میز صاف کرتے ہوئے میں اسے یوں دعوت دیتی ہوں: "اگرچہ میں کافی جیسی تلخ تو نہیں۔ مگر میں تمہیں رات جگائے رکھوں گی۔"

"کھوٹا سکہ"

امریکہ میں رہ کر یہ عجیب اتفاق ہوا کہ امریکی اپنے مقابلہ میں اٹالین، فرینچ اور سکینڈے نیوین ممالک کے باشندوں کو جنسی لحاظ سے زیادہ آزاد بلکہ اچھے خاصے بے شرم سمجھتے ہیں۔ پبلک کسنگ بالعموم نوجوانوں میں ملتی ہے۔ سنجیدہ حضرات اسے پسند نہیں کرتے کہ اسے فرانسیسیوں کا شیوہ سمجھا جاتا ہے۔ لو وہ بھی کہہ رہے ہیں!

باقی رہی بکنی یا بیچ کے مناظر تو یہ ان کے کلچر کا حصّہ ہیں۔ اور معیوب نہیں البتہ وہاں جا کر عورتوں کو تاکنا یا بالباس ہو کر بے لباس کو گھورنا یا تصویر بنانا یہ بدتمیزی ہے۔ اگرچہ کیبل ٹیلی ویژن خاصہ آزاد ہوتا ہے تاہم میڈیا نے ایک طرح کا اخلاقی معاہدہ کر رکھا ہے کہ جنسی اشتعال والے مناظر نہ دکھائے جائیں۔ اسی طرح الکحل اور سگریٹ والے اشتہارات بھی نظر نہ آئے اب وہاں فلم کی کامیابی کے لئے جنس ضروری نہیں رہی۔ چنانچہ گذشتہ چند برس میں ریکارڈ بزنس کرنے والی فلمیں جیسے رایڈ ہٹ راکیٹر، بیٹ مین اور گھوسٹ لیٹر وغیرہ سب غیر جنسی تھیں اور اس کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔ اب چنڈ ولیم دوسری جانب ہے یا پھر سکھ والی بات۔ کبھی کبھی نہانے کو جی نہیں بھی تو چاہتا!

ایک طرف جنسی آزادی جو ہم مشرقیوں کو جنسی انارکی محسوس ہوتی ہے تو دوسری جانب طہارت پسندی کا یہ عالم کہ ایک مشہور کامیڈین پورنو سینما میں فلم دیکھ رہا تھا۔ ذرا زیادہ جوش میں آیا تو وہ کر بیٹھا جو کسی کامیڈین کو نہ کرنا چاہئے۔ کسی نے دیکھ کر رپورٹ کر دی۔ پولیس نے پکڑ لیا۔ کیس بنا اور ایسا سکینڈل بنا کہ بیچارے کا سارا کیریر خراب ہو گیا۔ مجھے بہت افسوس ہوا حاملہ کر کے لڑکی چھوڑ دو، تو کوئی نہ پوچھے مگر ذراسی ذاتی غلطی تو اتنی بڑی سزا۔ اور وہ بھی امریکہ میں؟

(امریکہ کے زیر تحریر سفرنامہ "اک جہاں سب سے الگ" کا ایک باب)

بہتر دُنیا کی تلاش

★ —————— جیلانی کامران

بیسویں صدی کے اختتام پر یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ یہ صدی ایک بہتر دُنیا کی تلاش کی صدی تھی اور اس تلاش نے انسان کے شعور کی کئی ان دیکھی جہتوں کو آشکار کیا تھا۔ بہتر دُنیا کے الہیاتی مفہوم سے غالباً ہمارے کلچر کا ذہن ناآشنا نہیں تھا۔ اور عبادات اور تصوّف کے حوالے سے بہتر دنیا کے بارے میں بھی کبھی کوئی شک نہیں رہا۔ لیکن بیسویں صدی کے دوران تلاش کے اس عظیم سلسلے نے جو سیاسی، معاشرتی اور انسانی صورت اختیار کی وہ ہمارے کلچر کی تاریخ میں شاید پہلی بار ظاہر ہوئی تھی اور غالباً پہلی بار بہتر دُنیا کا تصوّر لاکھوں انسانوں کے حوالے سے رونما ہوا تھا۔ قیام پاکستان اس کی ایک صورت تھی اور معاشرے کو اور انسان کو بدلنے کی کوشش دوسری صورت تھی۔ قیام پاکستان سے آٹھ دس برس پہلے ادبی دانشوروں کی جو نسل ظاہر ہوئی تھی، اُس نے لوگوں کے لئے ایک بہتر دنیا کی تشکیل کی خواہش کی تھی اور وہ اس مفروضے کی قائل نہ تھی کہ ادب کا کام عکاسی کا ہے۔ اس کے نزدیک عکاسی سے کہیں زیادہ ضروری فرض یہ تھا کہ دنیا کی شکل بدل دی جائے اور بہتر دنیا کو انسان کے ارضی ماحول ہی میں قائم کیا جائے ادبی دانش وروں کی اُس نسل میں ہمارے بڑے بڑے لکھنے والے شامل ہیں جنھوں نے نہ صرف ہمارے ادب میں ایک قابل فخر باب کا اضافہ کیا ہے بلکہ انسانی صورتِ حال کو بامعنی وسعت بھی دی ہے... ادبی دانشوروں کے اس قافلے میں حمید اختر کی زندگی اور اُن کی کہانیاں، دونوں شامل ہیں۔

تاہم یہ ایک عجیب بات ہے کہ اُس نسل کے ادبی دانشور جس انسانی اور فکری فضا کا حصّہ تھے اور جن اصولوں کی روشنی میں انسان کے لئے ایک نیا زمانہ تعمیر کرنے کے داعی تھے اُسے ادب کی ترجیحات میں نظر انداز کرتے ہوئے اس امر پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ وہ دانشور ادب کے تخلیق کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں؟ اور محض تحریروں ہی سے معاشرے کے بدل جانے کا امکان ہوتا تو جتنی تحریریں اس موضوع پر معرضِ وجود میں آتی رہی ہیں، معاشرہ کبھی کا بدل گیا ہوتا۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ معاشرے اور سسٹم شاید ادب سے اور اِس نوع کی تحریروں سے بہت کم بدلتے ہیں۔ معاشرے کے بدلنے کے لئے انسان کا بدلنا بھی ضروری ہے اور انسان کے بدلنے سے پہلے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اُس کی نظرت کا گراف کس مقام پر ہے؟ تاہم ان باتوں کے قطع نظر یہ سوال بھی برابر اہم ہے کہ اگر اُس نسل کا کوئی دانشور ادب کے منظر نامے کا حصّہ نہیں بن پاتا تو کیا اس کی کارگزاری بے معنی ہوتی ہے؟ بنی نوع انسان کی خاطر اور ایک بہتر دنیا کی تلاش میں سفر اختیار کرنے والوں کا ہمارے کلچر نے بہت کم ذکر کیا

ہے۔ حمید اختر کی زندگی ایسے قابلِ فخر انسانوں کی نمائندگی کرتی ہے۔

حمید اختر کی زندگی کا ابتدائی زمانہ بھی اچھے خوابوں کا زمانہ تھا۔ ان خوابوں کی بڑی خوبی یہ تھی کہ ان میں خواب دیکھنے والے کی اپنی آرزوئیں بھی کارفرما تھیں اور بے شمار لوگوں کی آرزوؤں کا اندمال بھی ان خوابوں میں شامل تھا۔ ان خوابوں کی دنیا سے حمید اختر کی زندگی میں (ان کے کئی دوستوں کی طرح) وہ دنیا ظاہر ہوئی جو اُن کی کتاب کال کوٹھڑی (۱۹۵۴ء) میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ کتاب ایک اہم سوشو سائیکولوجیکل (معاشرتی/ نفسیاتی) دستاویز ہے جس میں انسانی فطرت کے کئی پوشیدہ گوشے آشکار ہوئے ہیں۔ بظاہر ایک ہی بات دکھائی دیتی ہے کہ انسان انسان کا دشمن ہے لیکن اصل میں کچھ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے انسان کو ایسی صورتحال میں کوئی خارجی قوت دھکیل رہا ہے۔ کتاب جرم کے محرکات کا ذکر کرتی ہے۔ اور پھر جرم اور سزا کے مابین جو غیر انسانی تناسب نمایاں ہوتا ہے اس کی تفصیل دیتی ہے۔ لاہور کے قلعے کے اندر موجود عقوبت خانوں میں تعلیمیافتہ زیرِ تفتیش افراد پر کیا گزرتی ہے، اس حکایت کو بیان کرتی ہے۔ اور یہ سوال پوچھتی ہے کہ کیا بہتر دنیا کی تلاش واقعی ایک جرم ہے؟ اور کیا وہ لوگ جو انسان کی فلاح کے لئے امر بالمعروف کی پیروی کرتے ہیں مجرم ہیں؟ اور کیا واقعی جیل خانوں کے اہل کار اور سسٹم کے ساتھ وابستہ لوگ انسان کی بہتری کے انکاری ہیں؟ اور کیا وہ نہیں چاہتے کہ ایک ہنستی مُسکراتی ہوئی دنیا آشکار ہو اور وہ بھی اس میں شامل ہوں؟ اس کتاب میں ایسے سوال حمید اختر نے پوچھے ہیں۔ جیلخانوں کے اہلکار اور خود قیدی ایسے سوالوں کی پہچان سے محروم دکھائی دیتے ہیں۔ قید و بند کے اس ماحول میں انسان نظر نہیں آتا، گنہگار اور جفاکار دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں انسان کو ہر لحاظ سے توڑا جاتا ہے۔ بہتر دنیا کی تلاش کے سفر میں حمید اختر کا اس مقام سے گزرنا بھی ایک منفرد تجربہ ہے! حمید اختر کی کتاب 'کال کوٹھڑی' کو بہتر دنیا کے قیام کے حوالے سے سمجھنا بھی ضروری ہے۔

'کال کوٹھڑی' میں جتنا عرصہ حمید اختر نے لاہور اور ملتان کی جیلوں میں گزارا تھا' اُس دوران انھیں ایک ایسی صداقت کا علم بھی ہوا کہ انسان کی آزادی کی ایک جہت یہ بھی ہے کہ اُسے آسمان دکھائی دیتا رہے۔ اور وہ پھولوں اور درختوں سے بھی جُدا نہ ہو۔ حمید اختر کی نظر میں مناظرِ فطرت واحد وسیلہ ہیں جو انسانی فطرت کی فلاح کا سبب بنتے ہیں اور انسانی فطرت کو حوصلہ مند سے بہرہ ور کرتے ہیں۔ بہتر دنیا کی تلاش ایسی انسانی فطرت کے بغیر شاید ممکن بھی نہیں ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر لکھی گئی تحریروں میں حمید اختر کی تحریریں اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ ان میں انسانی فطرت اور خارجی فطرت کے مناظر کا باہمی رشتہ دکھائی دیتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں بھی انسان کے ارادے کو کمزور ہونے سے وہ خوشبو بچاتی ہے جو گھاس' فصلوں اور کھیتوں کی مٹی سے پیدا ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے جب سے انسانوں کے مابین اخوت کی خوشبو ختم ہوئی ہے' ایسی خوشبو جو مظاہرِ فطرت کے بطن سے پھوٹتی ہے، انسانوں کو اپنی جانب بُلا رہی ہے۔ حمید اختر نے تلاش کے سفر میں اس فکری عرفان کی دریافت کی ہے!

حمید اختر نے قید و قفس کی کہانی میں جرم اور سزا کے آہنی سلسلے کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ قانون کا عمل انسانی نفسیات کے علم کے عین خلاف کام کرتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قانون کا انسانوں کی دنیا سے قطعاً کوئی رشتہ نہیں ہے۔ حمید اختر کا خیال ہے کہ جرم کے فوراً بعد مجرم کی نفسیات میں تغیر برپا ہوتا ہے جسے بروقت اصلاحِ فطرتِ انسانی کے لئے بروئے کار لایا جا سکتا

ہے۔ پھانسی پانے والے مجرموں کی زندگی میں سے قانون 'توبہ' کا مقام حذف کر دیتا ہے اور جرم اور سزا کے درمیان کسی ایسے مقام کی خبر نہیں دیتا جہاں مجرم اپنے جرم پر پشیمان ہو اور اُسے اپنی رُوح پر کڑا بوجھ محسوس ہوتا ہو..... حمید اختر شاید اس ضمن میں یہ سوال پوچھتے ہیں کہ کیا بہتر دنیا ایسے انسانی ماحول میں قیام پا سکتی ہے جہاں انسانی ضمیر کے بیدار ہونے کی کوئی گنجائش نہ ہو؟ اور جہاں مجرم کے باطن کو اس کے انسان ہونے کے تصوّر سے محروم سمجھا جائے اور ایک ایسے آہنی سلسلے کو جرم و سزا کے میزان میں برابر شامل کیا جاتا رہے جو نفسیات کے ادراک سے یکسر ناواقف ہو!

سیفٹی ایکٹ کے تحت حمید اختر اور ان کے کئی دوستوں کی گرفتاری کے جو بھی محرکات تھے، ان کی اہمیت وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتی گئی ہے۔ تاہم جس حکم نامے کے تحت کارروائی کی گئی تھی اُس کی محکمانہ اصطلاح (احتیاطی نظربندی) غور طلب ہے۔ احتیاطی نظربندی بظاہر ایک بے ضرر شے دکھائی دیتی ہے۔ لیکن جیلخانوں میں اسے جس طرح سمجھا جاتا ہے اور اس کا جو مفہوم لیا جاتا ہے وہ انسانی فطرت کے لئے ایک اُلجھا ہوا سوال بن جاتا ہے۔ ملتان جیل میں احتیاطی نظربندی سے مراد وہ سزا تھی جو جیل خانے کی زبان میں دوم تنہائی سے منسوب تھی۔ جیل کے اندر سزا کی نوعیت کئی اعتبار سے اہلکاروں کی انسانی فطرت کی نشان دہی کرتی ہے۔ حمید اختر کو دوم تنہائی کے بند کمرے میں قید کرنا احتیاطی نظربندی کا مقصد شاید نہیں تھا۔ لیکن جیل کے افسران کی تشریح سے یہ بات تو ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ انسانی فطرت غالباً ظلم کرنے میں خوشی اور اطمینان محسوس کرتی ہے۔ اس صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے حمید اختر انسانی فطرت کی حالتِ زوال کو جیل کے رولز اور ریگولیشن کا نتیجہ گردانتے ہیں۔ اور اہلکاروں کو ملازمت کی مجبوری کے آگے بے بسی تصوّر کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں حمید اختر انسانی فطرت سے مایوس دکھائی نہیں دیتے وہ جیل کے عملے کو قابلِ رحم خیال کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں انسان شاید اس لئے ظالم بنتا ہے کہ جس نظام سے اس کی گزر اوقات وابستہ ہے۔ وہ اُسے ظلم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن ایسا نظام کیسے معرضِ وجود میں آیا ہے؟ اور اسے کیوں انسانی زندگی کے ساتھ مستقل طور پر منسلک کیا گیا ہے؟ ایسے سوال ہیں جو حمید اختر کے بتاتے ہوئے واقعات سے برابر رونما ہوتے ہیں۔ تاہم ایسے ہی ایک موقعہ پر جب ایک پھانسی کا مجرم اپنی کوٹھڑی میں خودکشی کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پکڑا جاتا ہے تو جیل کا ڈاکٹر بڑے اطمینان سے یہ کہتا ہے کہ مجرم نے زیادہ دودھ لگوانے کے لئے ایسا کرب کیا ہے؟ کیا انسانی فطرت کے زوال کی اس سے بدتر صورت بھی ممکن ہے؟ اور کیا انسانی ضمیر کے ماؤف ہونے کی کوئی اور مثال بھی دی جا سکتی ہے؟ حمید اختر کے فن اور ذہن کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے انسانی فطرت اور ضمیر کے مشاہدے سے انسان کو سمجھنے کی صورت پیدا کی ہے اور معاشرے کی شناخت کے لئے انسانی ضمیر اور فطرت کو معیار بنایا ہے۔

حمید اختر اپنی کہانیوں کے حوالے سے ایک تیز رفتار بدلتے ہوئے معاشرے کے واقعہ نگار ہیں۔ جس دور میں حمید اختر نے کہانی لکھنے کی ابتدا کی تھی وہ فکشن میں کردار نگاری کا زمانہ تھا۔ احمد ندیم قاسمی کی کہانیوں میں کردار حالات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ منٹو کے افسانوں میں بھی کردار ایسی ہی کیفیت کو رونما کرتے ہیں۔ دونوں کے فن میں کردار کا مقام مرکزی ہے۔ کردار اپنے بارے میں تمام تر توجّہ کو اپنی جانب مبذول اور متحرک کرتے ہیں۔ حمید اختر کی کہانیوں (لامکاں - ۱۹۹۱ء) میں معاشرے کے تیز رفتاری سے بدلتے ہوئے سلسلے ایک پھیلے ہوئے تاریخی تناظر میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے حمید اختر کا افسانہ اس معاشرے کی

کہانی ہے جو قیام پاکستان کے ساتھ معرضِ وجود میں آیا ہے جس میں لوگوں کے خواب، ان کے نفسیاتی رویے، ضرورتیں اور مسائل اور آبادی
کا غیر منظم پھیلاؤ اور اخلاقیات ٹوٹتے، بگڑتے، پاش پاش ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کہانی کا تناظر بہت وسیع ہے جہاں بےشمار
لوگ ایک عہد سے دوسرے عہد میں وارد ہوتے ہیں۔ اور نئے زمانے کے ساتھ اپنے نئے تعلقات اور رشتے کو قائم کرتے ہوئے پریشانیوں
اور ہزیمتوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایسے تمام اجزاء جو کہانیوں کی شکل بناتے ہیں، درحقیقت لوگوں کے عقب میں اُن قوتوں کی
کارفرمائی کو نمایاں کرتے ہیں جن کا کام صرف افراد کو اِدھر سے اُدھر دھکیلنا ہے۔ سوشیالوجی کا یہ اندھا عفریت لوگوں کو زندگی
کے معانی سے محروم کرتا ہے۔ اور ان کے ارادے کمزور سے کمزور تر ہوتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اِس کہانی کا مورال یہ ہے کہ ایسے
صبر آزما ماحول میں لوگ برابر زندہ رہنے کی آرزو کرتے ہیں اور بہتر دُنیا کی تلاش میں اچھے اور بُرے راستے پر سفر کرتے ہیں۔ راستے
ان کی مرضی سے ظاہر نہیں ہوتے، سوشیالوجی اُن کے راستے بتاتی ہے۔ اس لئے جتنے بھی لوگ سامنے آتے ہیں خواہ وہ بکنے والی نوعمر
لڑکیاں، یا نوعمر اُداس دُلہنیں ہوں، یا ایسے افراد ہوں جو لوگوں کی کم فہمی سے اپنا پیٹ پالتے ہیں، ان کے عقب میں معاشی حالات کا
آسیب ہی نظر آتا ہے۔ حمید اختر کی کہانی لوگوں کی نہیں، معاشی حالات کے دباؤ کی کہانی ہے۔ اور اس اعتبار سے قابلِ ذکر بھی اور
قابلِ غور بھی ہے! سوشیالوجی کے جس عفریت کا ذکر کیا گیا ہے وہ بہتر دنیا کی تلاش میں حائل دکھائی دیتا ہے اور جسے کہانی کار
صورتِ حال اور فرد کے رشتے میں پہچانتا ہے۔ لیکن صورت حال بہت بڑی اور الجھی ہوئی ہے اور اس میں گرفتار انسان کم مایہ ہو چکا
ہے! حمید اختر کی لکھی ہوئی کہانی اس اعتبار سے بہتر دُنیا کی تلاش کے سلسلے میں انسانی فطرت کے المیے کو دلیل کے طور پر پیش کرتی
ہے۔ اور سوال کرتی ہے کہ کیا صورتِ حال اور فرد کے ایسے غیر متوازن اور غیر متناسب رشتے سے بہتر دُنیا کی تلاش کا مرحلہ طے ہو سکتا ہے؟
حمید اختر نے اپنی کہانیوں کے مجموعے لاامکان (۱۹۹۱ء) کے آغاز میں انسانی حالات کی زوال پذیر صورت کا ذکر کیا ہے اور دُکھ کے
ساتھ لکھا ہے کہ انسانی جغرافیہ برابر انحطاط کا شکار ہے اور بدقسمتی سے برابر ہو رہا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ اخلاقیات اور معاشی بحران کا زوال
پذیر سلسلہ ہر نئی نسل کی پراگندگی کا سبب بنتا رہے گا۔ اس زوال پذیر کیفیت کی اعلانیہ تشہیر نے ذہنوں کے زوال کے بارے میں بے حس کر دیا ہے
اور بہتر دنیا کی تلاش کا انسان ساز تاثر زائل ہو رہا ہے۔ حمید اختر کی کہانی اس مقام پر اپنے اختتام کو پہنچتی ہے اور اُن کے سوالات کو ذہنوں
میں پیدا کرتی ہے کہ بہتر دُنیا کی تلاش اگر لوگوں کی سائیکی کا جزو ہے تو اُس دنیا کی تشکیل کس کی ذمہ داری ہے؟ حمید اختر کی کہانی
کے مرزا دبیر الحسن کی موت کی ایک اخلاقی جہت یہ ہے کہ معاشرے کے بطن سے ایسا انسان پیدا نہیں ہوا جو بہتر دُنیا کی تشکیل کا
محور بن سکتا ہے۔ غالباً عہدِ حاضر کی ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ بہتر دنیا کی تشکیل جمہوری اداروں ہی کے ذریعے ممکن ہو سکتی ہے اور جمہوری
اداروں کے لئے فرد کی تشکیل ضروری ہے۔ شاید اسی لئے بہتر انسان کے بغیر بہتر دنیا کی تشکیل بھی ممکن نہیں ہے۔ حمید اختر کی کہانی کی
اہمیت بھی اس امر میں ہے کہ یہ کہانی اپنی دردمندی میں بہتر انسان کی تلاش کرتی ہے تاکہ بہتر دنیا کی تلاش جاری رہے اور بہتر دُنیا
کا قیام عمل میں آئے۔ حالات نے سائیکو پیتھی کو رونما کیا ہے۔ اور سائیکو پیتھی نے حالتِ زوال کو شاید قبول کر رکھا ہے۔ حمید اختر
کی کہانی اور ہمارے عہد کا ادب رائے عامہ کے تلاطم زدہ ماحول میں کسی حد تک اپنا مقام پیدا کر سکتے ہیں، ایک ایسا سوال ہے جس کا ہر ذہن میں دہرایا جانا
ضروری ہے تاکہ بہتر دنیا کی تشکیل کے لئے بہتر دُنیا کی تلاش ہوتی رہے اور نسل در نسل بہتر انسان رونما ہوں جن کی آرزو حمید اختر نے لاامکاں کے انتساب میں کی ہے۔

لکھ دا شوق، لکھ دا ذوق

ڈاکٹر اسلم رانا

پنجابی شاعری دی ایہہ خوش بختی مڈھ توں اوہدا مقدر رہی اے کہ جیہڑیاں شاعراں نے ایہنوں اپنے اپنے اظہار دا ذریعہ یاں وسیلہ بنایا اوہ اپنے اپنے عہد دے علماں دے اُچے تے سچے عالم فاضل لوک سن۔ اُنج بھاویں ظاہری حوالے نال ویکھن وچ ایہہ محسوس ہووے کہ جیہڑی شاعری اوہناں نے کیتی اے اوہدے پچھے علم توں ودھ اوہناں دے جذبے، واردات تے حال دا زور اپنا کرشمہ وکھا رہیا اے۔ پر ایہہ جذبہ، واردات تے ایہہ حال نرے پُرے وقتی اُبال دا نتیجہ نہیں ہندے۔ ایس کیفیت نوں حاصل کرن واسطے "ہڈاں دی اگ" بالنی پیندی اے۔

جدوں اسیں جدید پنجابی شاعری دا مطالعہ کرنے آں تے اودوں وی اک بڑی اچرج تے نویکلی گل سامنے اوندی اے کہ پنجابی دا جدید شاعر، کدی تے انج ہندا اے کہ اوہ اُردو زبان وچ اپنا اظہار کر دیاں کر دیاں پنجابی ول پرت اوندا اے تے ایہہ معمہ نرا رسمی یاں موہنہ دا سواد بدلن واسطے نہیں ہندا۔ انج جاپدا اے کہ جیویں اوہدے کول کوئی گل آکھن والی اجیہی رہ گئی سی جیہڑی پنجابی دے محاورے دا راہ پئی تکدی سی۔ تے یاں پھر انج ہویا کہ دوجیاں زباناں دے ادب دے ماہر جدوں اپنے من تے اپنی رُوح اتے واپری گل کرنا چاہندے نیں تے اوس سمے غیر زبان دا سانچا اوہناں دا ساتھ نبھاون توں انکاری ہو جاندا اے۔

"لکھ دا شوق" دے خالق اسماعیل بھٹی ہوریں ایس دوجے قبیلے نال تعلق رکھدے نیں کہ انگریزی زبان تے ادب پڑھنا تے پڑھانا اوہناں دا دن رات دا کم اے۔ تے ایس اعتبار نال انگریزی تے اوہدے شعری اظہار دے سلیقے اوہناں کولوں لُکے چھپے نئیں۔ پھر اوہناں دے سامنے انگریزی دے تخلیقی ادب دی صدیاں اُتے کھلری ہوئی اک روایت وی موجود اے جیس نوں اوہدیاں صلاحیتاں دی وجہ نال کسے طرح وی نہ تے نندیا جاسکدا اے تے نہ ای اوہدے توں اکھاں چرائیاں جاسکدیاں نیں۔ ایس واسطے بندہ ایہہ سوچ کے کجھ حیران ہو جاندا اے تے اچنبھے وچ پے جاندا اے کہ اخیر اوہ کیہڑے لُکے چھپے جذبے یاں محرک سن جنہاں دی وجہ نال اسماعیل بھٹی ہوراں نے اپنے اظہار واسطے پنجابی شاعری دا سہارا لیا۔ ایہدا جواب جے ناممکن نہیں اے تے مشکل ضرور اے۔

"لکھ دا شوق" اسماعیل بھٹی دی پنجابی شاعری دا دوجا مجموعہ اے۔ ایہہ گل وی نہیں کہ اوہناں نے

انگریزی زبان وچ لکھن دا تجربہ ای نہ کیتا ہووے۔ کیوں جے انگریزی ادب دی تنقید دیاں کتاباں انگریزی تے اردو دوہواں زباناں وچ پڑھ لکھ چکے نیں تے جیویں اسیں پہلے آکھیا اے کہ جیہیں بندے دا دن رات شغل انگریزی بولنا، انگریزی ...... پڑھنا، انگریزی لکھنا تے انگریزی پڑھانا ہووے۔ اوہدے واسطے انگریزی وچ تخلیقی اظہار کوئی مشکل امر نہیں رہ جاندا، سگوں اک اعتبار نال ویکھئے تے اَج دے دور اندر وی جدوں اسیں اپنی شناخت لئی، اپنے تشخص تے اپنی پچھان واسطے اپنیاں زباناں تے ادب دا چرچا کردے تھکدے نہیں۔ ایہ وی انگریزی زبان دا مان اینا کو باقی اے کہ جے کوئی بوہتی اہم گل پورے زور تے جذبے نال بیان کرن دی لوڑ محسوس ہووے تے اوہدوں انگریزی زبان دا اک تھوڑا جیہا جانوں وی کجھ جملے انگریزی وچ آکھن دی کوشش ضرور کردا اے۔ بھاویں اک دو فقریاں توں بعد اوہدی انگریزی مُک ای کیوں نہ جاوے۔ تے ایسے طرح جدوں ساڈے سماج دے اتلے طبقے دے مرد تے سوانیاں جدوں فیشن ایبل پارٹیاں وچ اکٹھے ہندے نیں تے اوس سمے اوہ اپنی اپنی انگریزی دانی دے اظہار نوں وی اپنی وڈیائی دا اک ضروری حصہ منِدے نیں۔

ایہو جیہی صورت حال تے سماجی ڈھانچے وچ اک سچ مچ دا انگریزی دان پنجابی وچ شعر آکھن لگ پوے تے اوہدے پس منظر وچ اک گل تے ضرور ہندی اے کہ اوہدا تخلیقی اظہار پنجابی دے سوا کسے ہور محاورے نوں قبول کرن واسطے تیار نہیں اے۔ ایہدا مطلب دوجیاں لفظاں وچ ایہہ وی ہو سکدا اے کہ پنجابی ایہجے وچ شاعر نوں اپنی اپنائیت تے اینا گوڑھ نظر پیں اوندا اے؛ جتّاں اوس علمی زبان وچ نظر نہیں اوندا جیس اُتے اوہنوں پورا پورا عبور حاصل اے۔ یاں پھیر خورے ایہہ گل ہووے کہ جیس پس منظر وچ اوہدے تخلیقی جذبے نے اظہار دا تقاضا کیتا اے اوس منظر دا رنگ روپ پنجابی زبان وچ ای ابھر تے نکھر سکدا ہووے۔ جیلانی کامران دا خیال اے کہ تخلیقی جذبہ جتّاں پنجابی شاعری وچ اَج کل ظاہر ہویا اے اوہ پاکستان دی کسے ہور زبان وچ نظریں نہیں اوندا۔ پر ایہدے نال ای اوہناں نے اک ہور گل وی آکھی اے کہ پنجابی نظماں وچ ساڈی تہذیبی روایت نے اظہار دا اک نواں روپ لبھ لیا۔

"کُکھ دا شوق" وچ جیہڑیاں نظماں شامل نیں اوہناں وچ غزل نوں چھڈ کے عام طور تے آزاد نظم دی تکنیک ورتی گئی اے۔ تے ایہدے وچ بوہتی تعداد نکیاں نظماں دی اے۔ ایخ جاپدا اے جیویں اظہار دا لمحہ اسماعیل ہٹی ہوراں واسطے تکمیل دا لمحہ وی اے تے تکمیل دے بعد پھیر ہور کوئی مقام نہیں رہ جاندا جیہدی بندہ تاہنگھ کر سکے۔ ایسے واسطے خورے اوہ بوہتی لمّی نظم نہیں آکھدے کہ تکمیل دا تقاضا کھلار نہیں۔ سگوں CONCENTRATION یعنی ارتکاز ہندا اے۔ "کُکھ دا شوق" دیاں مڈھلیاں دو نظماں ایس رجحان دی نفسیات نوں تمثیلی انداز وچ بیان کر دیاں نیں۔ پہلی نظم "حُسن تے موت" اے۔ جیہدے وچ شاعر دا تجربہ ایہہ اے کہ اپنے آپ نوں ظاہر کرنا "اپنے ہتھیں مرجانا ایں" دوجی نظم ایہدے بالکل الٹ اک کیفیت نوں پیش کر دی اے۔ "رولا گھولا" اک اجیہے بندے دی وارتایاں کہانی اے جیہڑا اپنے باہر دے سارے ٹھاٹھ باٹھ ہنڈیا ہوئیاں وی اندروں بالکل پھوکا اے تے اپنے ایس پھوکے پن نوں لکاون واسطے "رولا گھولا" پا رہیا اے تاں جے لوکیں اوہدی روح دی بنجر دھرتی تے من دی بانجھ ہستی تے شعور دی ویران سرتی نوں سمجھ نہ سکن۔

ایہناں دوہاں نظماں دے حوالے نال آکھیاں گئیاں گلاں ظاہری طور تے دو متضاد کیفیتاں نوں ظاہر کردیاں نیں۔ اک پاسے تے تخلیق دا جذبہ اے جیہڑا بے نیہارا اے تے کسے رکاوٹ نوں قبول کرن واسطے تیار نہیں بھاویں ایہدا انجام اپنے سجھیں مر جانا ای کیوں نہ ہووے تے دوجے پاسے اک اجیہی تخلیق اے جیہدا "دولا گھولا" کسے شے نوں تے کسے عیب نوں لُکا رہیا اے۔ پر جے گوہ نال ویکھئے تے ایہہ کوئی متضاد کیفیتاں نہیں۔ زندگی دے جیس آشوب بھرے ظالم تے مادہ پرست دور وچوں اج دے عہد دا انسان گزر رہیا اے۔ اوہدے ساہمنے ایہہ دونویں کیفیتاں ہر ویلے موجود رہندیاں نیں۔ اک فارسی دے شاعر نے شمع دی مثال دے کے ایسے کیفیت نوں ایس انداز وچ ظاہر کیتا سی کہ "شمع سویرے دے وچھوڑے وچ بلدی رہندی اے تے جدوں سویرے دی منزل نیڑے آوندی اے اودوں اوہدی اپنی حیاتی مُک جاندی اے" اج دے انسان نے جتنی علم دی ترقی نال اپنے آلے دوالے روشنی دے ان گنت سورج روشن کیتے نیں اوناں ای اوہدے ذہن تے شعور دا رجحان تخریب دے ہنیریاں ول وی ودھدا چلا گیا اے۔ اک روایت اے کہ لینن دی میز اُتے اک کالسی دا بُت ہر ویلے پیا رہندا سی۔ جیہدے وچ ایہہ وکھایا گیا سی کہ اک باندر انسان دی کھوپڑی نوں اُلٹ پلٹ کے ویکھ رہیا اے۔ لینن نے ایہدے بارے ایہہ آکھیا سی کہ جے ہتھیاراں دی دوڑ ایسے طرح لگی رہی تے پھر اوہ ویلا دور نہیں جدوں سچّی مچّی باندر انسانی کھوپڑیاں نوں ویکھ کے حیران ہوون گے ایہہ کیہڑی مخلوق سی جیہڑی ایس دھرتی اُتے اپنے پچھے صرف اپنی موت دیاں نشانیاں چھڈ گئی اے۔ "دولا گھولا" ایسے احساس تے کیفیت دی ترجمان نظم اے۔ ایس طرح دے احساس تے کیفیتاں صرف ایہناں دوہاں نظماں وچ ای نہیں ایس مجموعے دیاں ہوراں وی کئی نظماں وچ موجود نیں۔

اج محسوس ہوندا اے کہ سوچ تے گیان دے اک تخلیقی لمحے وچ شاعر اُتے حیاتی دی حقیقت نے جیس انداز وچ اپنے آپ نوں ظاہر کیتا اے اوہ بے اعتمادی تے بے اعتباری دا لمحہ سی۔ شاعر دے شعور وچ اکو ای حقیقت کئی رنگ بدل کے ظاہر ہوندی اے کہ اظہار موت داناں اے تے جے تخلیقی جوہر آپوں اظہار اُتے مائل نہ ہووے تے پھر اوہنوں خارجی قوتاں موت ول کھچ کے لے جاندیاں نیں۔

"سُکھ دا شوق" دیاں نظماں دا مطالعہ کردیاں محسوس ہوندا اے کہ ایہناں وچ جیہڑا کردار اپنے آپ نوں ظاہر کرن واسطے وکھو وکھ استعارے تے کنایے استعمال کر رہیا اے اوہ کُلی لوکائی تے پوری کائنات دی اجتماعی سوچ تے سانجھے شعور دی علامت اے۔ جدوں جذبہ اک بندے تیکر محدود ہووے تے اوہدے وچ کسے نہ کسے تھاں تے رومانی پکھ ابھر پیندے نیں۔ رومان دی خاص نشانی ایہو ای اے کہ اوہ انفرادی کشمکش اُتے بوہتا زور دیندا اے۔ پر اوہدے مقابلے تے ایہناں نظماں وچوں جیہڑا کردار جھاتیاں پا کے خارج وچ ویکھ رہیا اے اوہنوں اپنے ذاتی دکھ درداں تاہنگھ پیار دا ایڈا احساس نہیں اے جناں اوہنوں کل لوکائی دے حاضر لمحے دی کیفیت تے اوہدے انجام دا فکر اے۔ ایسے واسطے ایہناں نظماں وچ پیار محبت دی ذاتی واردات دا تصور بوہت گھٹ اے مثلاً اک تھاں تے اسماعیل بھٹی ہوراں نے خالص رومانی پکھ ...... وچ اک حقیقت دا

اظہار کیتا اے۔ ؎

جھکھے تیرے محمل ورگے

سب دھرتی نوں چُمدے اُوتھے

ذرّہ ذرّہ شکرانے دے سجدے کردا (جوانی دا نشہ)

پر ایہناں مصرعیاں توں بعد جدوں حقیقت دا احساس شاعر نوں آکے ہونجھ لاؤندا اے تے اوہنوں فوراً احساس ہندا اے کہ ایہہ تے ؎

کل تے ویلے دے ڈاکو دا ڈیرہ جھکھے

لُٹ دا مال لاوارث رُلنا (جوانی دا نشہ)

سوچ دی ایس اکائی دے باوجود ایہہ نہیں کہیا جاسکدا کہ اسماعیل بھٹی ہوراں دیاں نظماں دا پیرایہ وی اکو جیہا اے اوہناں نے ہر موضوع دی رعایت نال اندازِ بیان دی اوہدے مطابق اختیار کیتا اے۔ ایس گل نوں بوہتیاں صحیح لفظاں وچ ایسی طرح ادا کیتا جاسکدا اے کہ نظم دا موضوع تے نظم دی ہیئت یاں خادم اسماعیل بھٹی ہوراں کول دو وکھریاں وکھریاں چیزاں نہیں۔ اُوناں چر کوئی خیال یاں تجربہ اوہناں دے ذہن وچ تشکیل پاؤندا ای نہیں جناں چر اوہنوں بیان کرن دا سانچا وی نال ای ظہور پذیر نہ ہووے۔ خورے تسیں ایس گل نوں مخول سمجھو پر حقیقت ایہہ اے کہ "ککھ دا شوق" وچ اک نظم اجیہی اے جیہدا عنوان اے "کھوتا" پر ایس عنوان نوں سُن کے جیہڑے نیم سنجیدہ جیہے احساس دل یاں ذہن وچ اُبھردے نیں اوہ نظم پڑھ کے اک نمیّ جیہی ٹیس وچ بدل جاندے نیں!

اُتے اسیں ایس گل ول اشارہ کیتا سی کہ اسماعیل ہوراں نے انفرادی یاں ذاتی سوچ نوں اپنیاں نظماں دا موضوع نہیں بنایا۔ پر "ککھ دا شوق" وچ دو نظماں خالص ہڈبیتی واردات دا اظہار نیں۔ یعنی "حادثہ" تے "ایسٹ سرجیکل وارڈ"۔ "حادثہ" وچ اوہناں نے بڑے نفسیاتی انداز وچ اوس لمحے نوں لفظاں وچ قید کر لیا اے جیہدے وچ اک حادثہ اوہناں نوں پیش آیا سی۔ تے جے غور کریئے تے انج لگدا اے کہ ہر حادثہ ایس طرح ای ہوندا ہووے گا۔ "دُجھے ذہن دی کالی پٹی" ہمیش آدمی نوں اپنے ماحول توں غافل کر دیندی اے جیہدا نتیجہ کوئی نہ کوئی حادثہ ای ہوندا اے، بھانویں اوہ حادثہ ذہنی ہووے تے بھانویں جسمانی۔ دوجی نظم وچ ہسپتال دے اک وارڈ دا منظر اے۔ ایس منظر وچ شاعر وی شامل اے۔ پر اخیر اوہدی سوچ ذاتی سطح توں اچیری ہوون لگ پیندی اے تے ذات توں کائنات ول سفر کرن لگ پیندی اے۔

"ککھ دا شوق" دیاں بعضیاں نظماں دے موضوع خالص علمی نیں۔ پر بھٹی ہوراں نے اوہناں نوں اک تخلیقی رُوپ وچ بدل کے اثر انگیز، معنی خیز تے دلفریب بنا دتا اے۔ مثلاً "گورکھ دھندے" والی نظم انج شروع ہوندی اے ؎

ایہہ یہودی بڑے سیانے

دوجیاں خاطر

تخلیق

گورکھ دھندے بن دے رہندے (گورکھ دھندے)

پر اگاں جدوں ساری نظم نوں پڑھیئے تے پتہ لگدا اے کہ ایہدا موضوع کارل مارکس تے فرائیڈ نیں ۔ اک نے ڈھڈ دی گل کیتی تے دوجے نیں "ڈھنیں تھلے" دی گل کیتی اے ۔ تے پھر جاکے محسوس ہوندا اے کہ ایہو دیاں نے جیہڑے "گورکھ دھندے" بنائے سن اوہ کھڈا نے نہیں سن ۔ اوہناں نے تے پوری لوکائی واسطے گنجلاں دے ڈھیر لا چھڈے نیں ۔ ایسے سلسلے وچ اوہناں نے ایس عہد دی بین الاقوامی کشمکش نوں "شفنے داروزیں" کری نہ سمجھ سکیا ۔ تے "کمپیوٹر" ورگیاں نظماں وچ بڑے فنکارانہ استعاریاں وچ بیان کیتا اے ۔ "شفنے داروزیں" دا پہلا بند پڑھدیاں ہویاں اقبال دی اوہ فارسی نظم یاد اوندی اے جیہدا اک مصرعہ اے

ع تو شب آفریدی چراغ آفریدم

پر اگانہہ چل کے نظم دا موضوع وکھریاں ہو جاندا اے :

اج بندہ
اپنی دُنیا آپ بنا کے
جان بچاون دے
چارے کردا
ہنبھ چلیا اے
(شفنے داروزیں)

"کمپیوٹر" وچ وی ایسے کرب دا اظہار کمپیوٹر دی زبانی دہرایا گیا اے ۔

پھیر اوہ میںوں جیہڑا اوہدی تخلیق اے
اینا مجبور رکھ کے
ایہہ کیوں نہیں سوچدا
جے اپنی مخلوق نال ایڈا دھرد
کھتوں دا انصاف اے
(کمپیوٹر)

ایس نظم وچ اک عجیب طرح دا احساس تے کیفیت موجود اے ۔ کدھرے نفی توں اثبات ول تے کدھرے اثبات توں نفی ول، کدھرے خارج توں باطن ول تے کدھرے باطن توں خارج ول کدھرے موجود توں ناموجود ول تے کدھرے ناموجود توں موجود ول ۔ کدھرے متفق توں نامتفق ول تے کدھرے اُلست توں قالُو بلا ول اک مسلسل سفر دی کہانی نوں اک بے بس کمپیوٹر دی زبانی بیان کیتا گیا اے جیہڑا اپنے خالق دے ہتھاں وچ اک کھڈاؤنا بنیا ہویا اے ۔

اسماعیل بھٹی نوں ایہہ احساس بڑی شدت نال اے کہ دنیا اپنی اخیرلی تباہی دے کنارے تیکر اپڑ چکی اے پر ایس دے باوجود ایس ساری خوفناک دنیا وچ اوہناں نوں اجے وی خیر دی آس دا اک نماں نماں بلدا دیوا نظریں اوندا اے تے ایہہ اتفاق دی گل نہیں سگوں سارے انسانی دردمنداں دی روح تے شعور دا نچوڑ اے کہ اوہ بھائی چارہ

تحلیق

مہر محبت تے امن جیہڑا ساڈے روایتی اخلاص دا آئینہ دار اے تے اصل وچ حیاتی واسطے جے کوئی حقیقی سواد اے تے اوہدے وچ اے : ؎

اُچے شملے
اَنکھاں ، شرماں
اُچے مان تران نہیں لبھنے
میلے لُٹ گئے
کیہہ لبھدا ایں
کیہہ دسنا ایں
نواں زمانہ ، نویں لیسارے
توں کوئی ہور ایں
(ویلا ہور اے)
ویلا ہور اے

ایہدے وچ خورے رسمی طور تے کوئی نقاد NOSTALGIA دا پہلو کڈھ کے نظم نوں موضوع دی رسمی تکرار کہہ کے گل مکاؤنی چاہیے ۔ پر اصل حقیقت ایہہ اے کہ موجودہ سوچ دے جیہیں کیسے تے گنجھلدار روپ دا ذکر اسماعیل بھٹی دیاں ہورناں نظماں وچ ملدا اے اوہنوں ایس پس منظر دے سامنے رکھ کے ویکھیئے تے اوہدے رنگ ہور وی ڈراؤنے ہو جاندے نیں ۔ ایس پس منظر دے بغیر خورے "کمپیوٹر" دا المیہ سمجھ وچ ای نہ آوے ۔

"ککھ دا شوق" دیاں نظماں دا انداز بیان سدھا تے صاف ستھرا تے دل وچ اتر جاون والا اے ۔ زبان سادہ پر سوہنی ورتی گئی اے ۔ غزلاں دے موضوع تے مضمون رسمی نیں ۔ پر غزل دے فنی حُسن نوں پوری طرح اُجاگر کیتا گیا اے تے اوہدے فنی تقاضے وی پورے کیتے گئے نیں ۔ "ککھ دا شوق" اصل وچ ککھ دا ذوق اے ۔ جیہدے وچ شاعر نے اپنے عہد وچ وسدی کُل لوکائی نال بڑے نیڑے ہو کے اک جاندار مکالمہ کیتا اے جیویں کوئی بندہ ہمالہ دی چوٹی اُتے بہہ کے ساری کائنات دے 'دُکھ' 'درد' 'کرب' تے غم دیکھ رہیا اے ۔ ایہدے نال نال اوہ دنیا وچ ہوون والے ظلم ، تشدد ، استحصال دے اُچے دیوتوں مونہہ پاڑی دُنیا بھر دے مظلوم انساناں نوں نگلن لئی ودھدا ویکھ رہیا اے تے اپنی توانا آواز دے ذریعے خبردار کر رہیا اے کہ لوکو اپنے آپ نوں پچھانو ، اپنی ہستی تے اپنے وجود دی آپے تصدیق کرو ، اپنے اندر دی شکتی اپنی مکتی واسطے باہر کڈھو ، تے اپنے آلے دوالے کھلریاں حقیقتاں دا ادراک حاصل کر کے حقیقت جاوداں بن جاؤ ۔ ایس طرح "ککھ دا شوق" ککھ سگوں کروڑاں تے اربان بندیاں دے ذوق ، آگہی ، شعور تے دانش دا اجتماعی استعارہ تے علامت اے تے اجتماعی انسانی ضمیر دی آواز اے ۔

رفعت سُلطان

غزل

ہر دم تینوں یاد کراں!
رووان تے فریاد کراں
دل دی اُجڑی دُنیا نوں
ہنجواں نال آباد کراں
تیری مرضی ہے تاں میں
سدھراں نوں برباد کراں
جیہڑا در تے آجاوے
میں اُس دی امداد کراں
کیوں تینوں بُھل جاواں میں
کیوں دل تے بیداد کراں
کی کی سوچ کے میں دل نوں
شاد کراں، ناشاد کراں
تیرے سوہنڑیاں وعدیاں تے
کیوں شک بے بُنیاد کراں
تیری شکل بناون لئی
کی کی رنگ ایجاد کراں

رفعت پیار دا قیدی اے
کیوں اُس نوں آزاد کراں

افتخار نسیمؔ
(شکاگو)

پال دے قتل دی خبر سُن کے

تیری موت دی خبر وی آخر
ٹی وی تے اخبار نے مینوں
دِتّی اے
ایہو خبر
جے کوئی میرا اپنا یار لیاندا
تے اوہنوں مَیں جھوٹا کہندا
اُتھرُو پیندا
اُتّوں ہس دا
وِچّوں روندا
جے تیری مَیں عورت ہوندا
اَپنیاں چوڑیاں توڑ کے
سر وِچ مٹی پا کے
عرشاں تو وی اُچّے اُچّے
وین مَیں کردا
جے تیری محبوبہ ہوندا
سب کرمکڑیاں کٹھیاں کر کے
وَصل فراق دے ٹپّے گاندا
آپ وی روندا
اوہناں نوں وی نال رُلاندا

جے کر تیرا بیلی ہوندا
اپنیاں یاراں دے وچ بیٹھ کے
تیرے قتل دا بدلا لیندا
قسماں کھاندا
جے کوئی رشتے دار مَیں ہوندا
کوڑی روٹی لے کے
تیرے گھر آندا
کی دسّاں مَیں کون آں تیرا
اس رشتے دی دنیا دے وچ
کوئی شناخت ای نئیں اے
اے رشتہ دو روحاں دے وچ
جسماں دی راہواں تو ہو کے
ازل پیاسے لوکاں دے وچ
بن جاندا اے
مَیں ای تیرا سب کچھ ساں
توُ ای میرا سب کچھ سیں
پر مَیں راتاں دے رشتے نوں
کِس کھاتے وچ پاواں
کس کھاتے وچ لکھّاں
اسی ہنیرے دے لوکی
دن چانن کد آواں گے
کدوں خود اپنے سر دے اُتّوں
ڈردی چادر لاواں گے

پال وردا PAUL VARDA اک دوست سی۔ جیہڑا شکاگو دے وچ اک GANG WAR دِچ ماریا گیا۔

بشریٰ اعجاز

نت ماہی لوڑی دا

ایہہ ورد نہ چھوڑی دا
نت ماہی لوڑی دا

کنیں جُھمکے ہجراں دے
متھے ٹِکے فکراں دے

باہنہ گانے ہتراں دے
نیئوں لا نہ توڑی دا
نت ماہی لوڑی دا

ایہہ روگ پریتاں دے
جیویں برج مسیتاں دے
دل اٹھ گئے میتاں دے
ایخ مان نہ توڑی دا
نت ماہی لوڑی دا

تیری باندی بردی ہاں
کلی ہو کے بھردی ہاں
راتیں سُتیاں ڈردی ہاں
ایہہ ہجر نہ چھوڑی دا
نت ماہی لوڑی دا

اسیں مندے موڑے ہاں
گلیاں دے کوڑے ہاں
مٹیاں وچ ذھوڑے ہاں
ایخ مُنہ نئیں موڑی دا
نت ماہی لوڑی دا

ایہہ وِرد نہ چھوڑی دا
نت ماہی لوڑی دا

ہک وچھوڑا ماہئے دا

ہک وچھوڑا ماہئے دا
جیہڑا راتیں سون نہ دیندا
اتوں خلقت میہنے مار دی
دُکھ منجی پون نہ دیندا
راتیں گِدڑر باگھ بولیندے
وینہیں لوک دلیلاں ویندے
کنوّں ڈوری اکھیّوں اَنھی
کجھ ہجر سجھون نہ دیندا
جیہڑی سیج کنڈاں دی واڑی
اوتھے پہنچ گئی ہیں ہار فی!
دکھ ہڈاں دے وچ بال فی
ایہہ عشق کھلون نہ ویندا
میوں شاہواں جاہواں ڈنگیا
ست رنگ عشق نے رنگیا
ہیں ہوئی لال و لال فی!
دل تجھے بھون نہ دیندا
کنڈیاں تے جان پروتی
کوئی ساڈے جیہی نہ ہوسی
اکھیاں چوں لہو ڈُلدا!
کوئی اندروں رون نہ دیندا
کوئی اوہ دی ویلا ہوسی
جیہڑا کنڈے پا کے تولسی
جیہڑا رات دی بولی بولسی
جیہڑا وینہہ نوں ہون نہ دیندا

تبصرے

کلیاتِ سحر

• شاعر: کنور مہندر سنگھ بیدی سحر • مرتب: کے ایل نارنگ ساقی
• ناشر: کنور مہندر سنگھ بیدی کمیٹی۔ ایل ۴۔ کناٹ سرکس۔ نئی دہلی۔ • قیمت: ڈھائی سو روپے • تبصرہ: امینہ عنبرین

کنور مہندر سنگھ بیدی کی شخصیت برصغیر میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ صرف شاعر ادیب ہی نہیں اُن کے مداحین میں ہر مکتبۂ فکر اور ہر شعبۂ زندگی کے لوگ شامل ہیں۔ بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ کنور صاحب ایک ایسی شخصیت ہیں (تھے) جو خدمتِ خلق، کشادگیٔ قلب، وسعتِ نظر اور اخلاص و ایثار اور مہر و محبت کی مثال تھے اور بلاشبہ اُن کی شاعری میں بھی ان اوصاف کا عکس صاف نظر آتا ہے۔!

زیرِ نظر کتاب کا ایک حصہ غزلیات پر، ایک نظمیات اور ایک متفرقات پر مشتمل ہے۔ غزلیات میں اگرچہ زیادہ تر روایتی شاعری کی اصطلاحات اور الفاظ کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں لیکن وہ مزہ دیتی ہیں۔ غمِ ہجراں اور غمِ دوراں کے بیچ رہ کر بھی...... وہ مسکرانے کا ڈھنگ جانتے ہیں۔ ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ اور کہیں کہیں مزاح کا رنگ روتے روتے مسکرا دینے کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ خوبصورت فارسی آمیز معیاری اور دل کو چھو لینے والے اشعار پڑھ کر کنور جی کے "سنگھ" ہونے پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ یوں بھی یہ انسانیت دوست سکھ صرف انسانیت کو ماننے کا دعویٰ کرتا ہے۔ بلا امتیاز مذہب و ملت و جغرافیائی حدود وہ سب سے پیار کرنا چاہتا ہے۔ پیار کرنا سکھاتا ہے۔ وہ ایک طرف گرو نانک کا پرستار ہے تو دوسری طرف عاشقِ رسولؐ ہونے کا دعویدار بھی ہے۔ اور یہ کہتے ہوئے شرماتا نہیں کہ محمدؐ صرف مسلمانوں کی ملکیت نہیں وہ سب کے ہیں اور ان سے محبت کرنے کا حق کسی کو بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے شعروں میں اپنی جنم بھومی یعنی پاکستان کے لئے والہانہ محبت ٹھنڈے میٹھے چشمے کی طرح بہتی دکھائی دیتی ہے۔ حصہ نظمیات میں مختلف ہندو سکھ، مسلمان مقتدر شخصیات کے بارے میں عقیدت بھری نظمیں اہم واقعات، حادثات اور مقامات کے بارے میں طبع آزمائی ہی نہیں کی عالم انسانیت کو امن و آشتی کا پیغام بھی دیا ہے۔ پیش لفظ میں گوپی چند نارنگ نے کنور صاحب کی شخصیت اور شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ کے ایل نارنگ ساقی نے کلیات ترتیب

دے کر بلاشبہ اردو ادب پر احسان کیا ہے اور کنور مہندر سنگھ بیدی کے پیغام محبت کو آگے بڑھانے کا اہم کام انجام دیا ہے۔ لیکن بھارت میں چھپنے والی دیگر کتابوں کی نسبت قیمت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

سیف الملوک

- مصنف : میاں محمد بخش
- مترجم : شفیع عقیل
- ناشر : انجمن ترقی اردو، پاکستان۔ کراچی
- قیمت : ایک سو پچاس روپے
- تبصرہ : ایمنہ عنبرین

داستانوں کے ادب میں مصر کے شہزادہ سیف الملوک اور شارستان کی پری بدیع الجمال کی داستان عشق دنیا کی کئی زبانوں میں نظم ونثر کی صورت ترجمہ ہو چکی ہے۔ - - - - - - - - - - - - - - اگرچہ یہ بہت سی دوسری داستانوں کی طرح فرضی داستان ہے۔ تاہم انسان کی کہنے اور سننے کی خواہش نے ایسی جذباتی اور واقعاتی داستانوں کو ہمیشہ زندہ رکھا اور انھیں آگے بڑھاتے رہنے کا کام بھی انجام دیا۔ پنجابی میں بھی اس داستان کو خوب سے خوب انداز میں پیش کرنے کی بہت سے شعرا نے کوشش کی جو اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں مولوی لطف علی، احمد یار گجراتی، میاں محمد صادق، دائم اقبال دائم، میاں حیدر علی، منشی کریم بخش شامل ہیں۔ لیکن پنجابی زبان میں اس قصے کو جس نے لازوال شاہکار بنا دیا وہ میاں محمد بخش ہیں جنھوں نے دوسرے صوفی شاعروں کی طرح عوام کے دلوں اور ذہنوں سے قریب ہونے کے لئے رومانوی داستانوں کا سہارا لیا لیکن صوفی شعرا کے کلام کو قومی اور دیگر علاقائی زبانوں میں ترجمہ کرنے کی ضرورت اپنی جگہ ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ اچھا اور صحیح ترجمہ ہی بہتر پیغام رسانی کر سکتا ہے۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کے زیر اہتمام شفیع عقیل نے میاں محمد بخش کی تصنیف سیف الملوک کو ترجمہ کرنے کی بہت بہتر کوشش کی ہے۔

شفیع عقیل پنجابی زبان کے ایسے شاعر اور محقق ہیں جو کراچی جیسی جگہ میں رہ کر بیشتر پنجابی کے محققین اور نقادوں سے زیادہ کام کر رہے ہیں۔ ان کا پنجابی کے لئے کیا ہوا بے شمار کام نہ صرف پنجابی زبان و ادب میں اضافے کا باعث بنا ہے۔ بلکہ ہمیشہ دستاویزی حوالوں کے کام آتا ہے۔

پنجابی جیسی اور یکسر زبان کا صحیح اور ٹھیک ٹھاک مترادف اور متداول لفظ تلاش کرنا بعض اوقات مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔ ایسی مشکل کہیں کہیں شفیع عقیل کو بھی درپیش نظر آتی ہے۔ تاہم یکجہتی اور خیرسگالی کے لئے اپنی تخلیقات کا مفہوم دوسروں تک پہنچا دینا بھی کار خیر ہے۔ یہ کتاب سفید کاغذ پر ہے پھر بھی ایسی رابطے کی کتابوں کی قیمت کم ہونی چاہیئے۔

سہ ماہی ادبیات

- مدیر : خالد اقبال یاسر
- ناشر : اکادمی ادبیات پاکستان۔ اسلام آباد
- قیمت : ۴۰ روپے
- تبصرہ : ادارہ

"ادبیات" پچھلے پانچ برس سے باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ ابتداء میں کچھ عرصے تک اس رسالے کا کوئی خاص مزاج متعین

نہیں ہو سکا تھا، اب اس رسالے کی اپنی پہچان ہے اور یہ باقی ادبی رسائل سے مختلف بھی نظر آتا ہے۔ یقیناً یہ رسالے کے مدیر کی محنت اور لگن کا نتیجہ ہے۔

زیر نظر شمارہ — اسلامی ممالک کی کہانیوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے اور بلاشبہ یہ بہت احسن اور بڑا کام ہے۔ اسے اولین کوشش نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس سے پہلے "سیارہ ڈائجسٹ" لاہور (اُس وقت مدیر ستار طاہر) کچھ سال پہلے ایسا ہی ایک نمبر چھاپ چکا ہے۔ تاہم، یہ ایسا کام ہے جسے مسلسل ہوتے رہنا چاہئے۔ تمام تر اشاعتی ترقی کے باوجود ابھی تک اُردو پڑھنے والا قاری اسلامی ممالک کی کہانیوں سے ناواقف رہا ہے۔ اگر کبھی کسی نے ادھر توجہ دی بھی۔ تو انگریزی زبان سے ترجمہ کیا گیا۔ اس طرح دو وسیلوں سے گزرنے کے بعد ممکن ہے کہانی کی روح بھی مجروح ہوتی رہی ہو — اس نمبر میں بھی نیرنگ، ترکی، اور ایران کی کہانیوں کے علاوہ باقی سب (شاید) انگریزی زبان ہی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ اکادمی کے ذرائع کافی زیادہ ہیں، اگر کوشش کی جائے تو عربی زبان کے مترجم مل سکتے ہیں، اور انڈونیشیا اور ملائشیا کی زبانیں جاننے والے اسلام آباد میں یقیناً موجود ہوں گے۔ خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔

اسلامی ممالک کی کہانیوں کا یہ خاص نمبر یقیناً دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ اس میں کئی ایسے ممالک کی کہانیاں بھی شامل ہیں، جنھیں اُردو میں شاید پہلی بار پڑھا جائے گا۔ یہ تعارف اور اضافہ اُردو ادب میں بھی اہم مقام پائے گا۔ کمپیوٹر کی کتابت اور سفید کاغذ پر خوبصورت سرورق والے اس خاص نمبر کی قیمت نہایت معقول ہے

"انشاء" — عالمی اُردو افسانے نمبر،

- مرتب: ف۔ س۔ اعجاز
- پتہ: کنائی سیل سٹریٹ۔ کلکتہ
- قیمت: ۱۲۰ روپے۔ ۲۰ ڈالر
- تبصرہ: ادارہ

بھارت میں اُردو زبان رسم الخط کی حد تک معدوم ہوتی جارہی ہے۔ اور جو زبان بولی جاتی ہے۔ اسے زیادہ تعداد میں لوگ ہندی کہتے ہیں۔ وہاں کی نئی نسل تو اس سے بالکل ناآشنا ہے۔ کچھ پرانے لوگ، چند اکادمیاں اور چند ایک رسالے اُردو زبان کو اس کی اصل صورت سمیت زندہ رکھنے کا جہاد کر رہے ہیں۔ اور وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہیں، مگر ان کے بعد کیا ہوگا۔ اس کا کبھی مثبت جواب نہیں ملا۔ بھارت کی کچھ یونیورسٹیوں میں اُردو کے شعبے ہیں، لیکن کیا ایم اے اُردو کرنے والے کو آسانی سے نوکری مل جاتی ہے۔ یہ سوال بھی اہم ہے۔ ایسے میں ف۔ س۔ اعجاز جیسے لوگ بلاشبہ مجاہد کہلوانے کا حق رکھتے ہیں۔ اور ان کا رسالہ انشاء تو ایسے کارنامے سرانجام دے رہا ہے جس کی یہاں پاکستان کے رسالے بھی ہمت اور کوشش نہیں کر سکے۔ یکے بعد دیگرے انشاء کے کئی اہم نمبر آئے ہیں، اور باقیوں کی نوید دی گئی ہے

عالمی اُردو افسانے کے عنوان والے خاص نمبر میں ۷۳۔ بہت عُمدہ افسانے، ایک افسانے کے موضوع پر مباحثہ، دو مضمون اور اداریے کے حوالے سے تیسرا سیر حاصل مضمون — اس خاص نمبر کی جان اور شان ہیں — افسانے والا مباحثہ بڑا دلچسپ اور معنی آفرین ہے۔ اس میں جوگندر پال، قمر رئیس، عتیق اللہ، شارب ردولوی، شمیم نکہت، ارتضیٰ کریم،

علی جاوید، نگہت ریحانہ اور خالد اشرف نے شرکت کی ہے اور کہیں ترقی پسندوں کو پچھاڑا اور کہیں علامتی لکھنے والوں کو للکارا ہے۔ بحث میں حصہ لینے والی خواتین کو یہ بھی اعتراض رہا کہ کیا یہ ضروری ہے کہ عورتوں کے مسائل پر صرف عورتیں ہی لکھیں؟ —— پریم چند کے بعد یہ سوال زیادہ تر تشنۂ تکمیل ہی رہا۔

اُردو لکھنے والے ساری دنیا میں جہاں جہاں موجود ہیں، انھیں کوشش کر کے اس نمبر میں شامل کیا گیا ہے۔ اور اس طرح ایک خوبصورت افسانہ نمبر ترتیب پایا ہے۔ ابتدائیے میں ف۔ س اعجاز نے افسانہ اور افسانہ نگاروں کے تجزوی اور مجموعی حالات کا جائزہ لیا۔ اور تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے پاکستان کے پنجابی لوگوں کی تعریف کی ہے جو اُردو کے ممتاز ادیب بنے مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ پاکستان میں اُردو کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے۔ پتہ نہیں اس سے اُن کی کیا مراد ہے؟ واقعتہً تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

کتابت و طباعت اچھی ہے اور افسانوں کے ساتھ خاکے بھی بنائے گئے ہیں۔ جو نمبر کی صوری خوبیوں میں اضافہ کرتے ہیں افسانوں کی فہرست میں ساتھ ساتھ ف۔ س اعجاز نے جو اشعار رقم کئے ہیں اُس سے بھی ندرت پیدا ہوتی ہے۔

"شاعر" —— افسانہ نمبر

- مدیر: افتخار امام صدیقی
- پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶۔ بمبئی۔ ۸
- تبصرہ: ادارہ
- قیمت: ۱۵ روپے

ابتدائیے میں مدیر نے ایک جگہ لکھا ہے —"کیا آپ نے محسوس کیا ہے کہ افسانہ اور آپ کے درمیان سے کہانی پھسل گئی تھی؟ افسانہ لوٹ تو آیا ہے مگر وہ اب بھی پوری طرح کہانی نہیں بن سکا ہے۔" افسانے میں کہانی کی تلاش کے مسئلے یا معاملے پر پچھلے کئی برس سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بیشتر لوگوں کی یہی رائے ہے کہ کہانی کہیں گم ہو گئی ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ اس کی بازیافت ہو چکی ہے اور کچھ اس بات پر مصر رہے ہیں کہ کہانی کبھی گم ہوئی ہی نہیں تھی۔ بہرکیف — یہ بات اپنے طور پر بہت اہم ہے۔ اور اس پر گفتگو ہوتی رہنی چاہئے۔

'شاعر' کے اس افسانہ نمبر میں تیس ۳۰ افسانے شامل ہیں اور رسالے کے تین شمارے یک جا کر دیئے گئے ہیں۔ اس میں افسانے کے موضوع پر غلام عباس، خالدہ حسین، جوگندر پال، وارث علوی، دلیوندر اسر، بلراج کومل، محمود ہاشمی، باقر مہدی، وزیر آغا، گوپی چند نارنگ، ممتاز شیریں، اور چند دوسرے نقادوں کی جو پرانی آرا شامل کی گئی ہیں، ان میں بھی اسی بحث یا گفتگو کی جھلکیاں ملتی ہیں اور اپنے اپنے طور پر ان معتبر حضرات نے کچھ نتائج بھی برآمد کئے ہیں۔

ان تیس ۳۰ افسانوں میں سے کچھ روایتی اسلوب میں لکھے گئے ہیں، کچھ جدید انداز میں، مگر ایک بات اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ ان سب میں کہانی موجود ہے۔ کتابت طباعت اچھی ہے اور رسالے کی روایت کے مطابق لکھنے والوں کی تصویریں اور پتے بھی دیئے گئے ہیں۔

'لہراں' ـ احمد ظفر نمبر

• مدیر: اختر حسین اختر • پتہ: ۵۷/۷ سوڈیوال کالونی۔ ملتان روڈ۔ لاہور
• مُل: ۴۰ روپے • تبصرہ: ادارہ

احمد ظفر ہوری پنجابی تے اُردو زباناں دے سُچّے پڑھدے تے جانے پچھانے شاعر نیں۔ ڈھیر ساریاں کتاباں لکھ چکے نیں تے اجے ایتھاں کو مواد اوہناں کول ہور وی ضرور ہووے گا۔ اوہ بھانویں ساری عمر ترقی پسند تحریک نال جڑے رہے، پر کسے دھڑے بندی وچ نئیں رہے۔ کلیاں رہ کے سوہنا تے نویکلا کم کردے رہے، کجھ انا پرست وی نیں، تائیوں نال اوہناں کسے دی جھوٹی بین وجائی اے نال اوہناں دے کسے نیں ڈھول کھڑکائے نیں۔ اوہناں جیہڑا سچا تے کھرا کم کیتا اے ایہہ اوہدا ای صدقہ اے پئی "لہراں" والیاں نیں اوہناں لئی اک جاندار تے شاندار نمبر ترتیب دِتا اے، جیہڑا بھانویں اپنے طور تے مکمل اے پر اک طرحاں ایس گل دی نیہہ دھر گیا اے پئی اگوں اوہناں تے ہور وی چنگا تے سُتھرا کم ہوندا رہسے۔

اپنے اک انٹرویو وچ احمد ظفر ہوراں آپے آکھیا اے پئی اوہناں ایس پاروں ویاہ نئیں کیتا جے اوہناں ترقی پسند تحریک نال شادی کرلئی اے۔ اپنے ایسے انٹرویو وچ اوہناں نے ترقی پسند لکھن والیاں دیاں غلطیاں دی دسیاں نیں تے اپنیاں کئی گلاں دا اعتراف وی کیتا اے ـــ سُنیا سی احمد ظفر ہوری آزاد کشمیر ریڈیو دی اک گلوکارہ نال پیار کردے سَن تے خورے شادی دا ارادہ وی سی، پر گل توڑ نال چڑھی۔ ایس انٹرویو وچ، ایہدا کوئی ذکر نئیں۔ انٹرویو دے اخیر تے "جاری" لکھیا ہویا اے۔ چنگا ہووے جے اوہناں دے دل دیاں معاملیاں دی سُوہ وی لائی جاوے۔ احمد ظفر ہوری چر تُوں لاہور رہے سَن اوہناں "اُردو ڈائجسٹ" دی نوکری وی کیتی نے فلماں لئی گانے وی لکھے، اوہناں دی کجھ پرتیت وی ہونی چاہی دی اے۔

مکدی گل ایہہ وے پئی احمد ظفر جِسے اُچے تے سُچے شاعر تے لہراں نے نمبر کڈھ کے اوہناں دے پیار کرن والیاں تے ادب پڑھن والیاں تے بڑا احسان کیتا اے۔ ایہہ کم ہمیش زندہ تے تابندہ رہوے گا۔

نیا کھاتہ

• مترجم: پیرزوز بخت قاضی • ناشر: کلاسیک۔ لاہور
• قیمت: ۱۲۵ روپے • تبصرہ: ادارہ

پیروز بخت قاضی ایک لمبے وقفے کے بعد ادب کی دنیا میں واپس آئے ہیں۔ سرکاری ملازمت کی ذمہ داریوں نے ادب سے بہت سے ذہین اور نابغہ لوگوں کو چھین لیا ہے۔ کئی لوگ تو شہاب ثاقب ثابت ہوئے، کچھ چاند کی طرح گھٹنے کے بعد بڑھے اور پھر بڑھتے ہی رہے۔ پیروز بخت قاضی اُسی بڑھتے ہوئے چاند کی طرح دوبارہ ادب کے آسمان پر جگمگانے لگے ہیں۔ ابتدا میں انھوں نے افسانے لکھے تھے۔ ان ترجمہ شدہ کہانیوں کے علاوہ انھوں نے کچھ دوستوں کے خاکے اور چند یادیں

بھی لکھی ہیں جنھوں نے ادب میں ان کے اعتبار اور معیار کو بحال کیا ہے۔ "نیا کھاتہ" یورپ، مشرقی یورپ اور کچھ دوسرے خطوں کی کہانیوں کے تراجم کا مجموعہ ہے، ان کہانیوں کے مصنفین اُردو ادب میں پہلے متعارف نہیں ہوئے تھے یا اگر ہوئے بھی تو بہت کم۔ مترجم نے عمدہ انتخاب کیا ہے اور تراجم میں ایسی سلاست اور روانی رکھی ہے کہ ان پر طبع زاد کہانیوں کا گمان ہوتا ہے۔ یہی کسی ترجمے کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

سفید کاغذ، اور کمپیوٹر کتابت سے مزین اس کتاب کا سرورق بھی اگر اچھا ہوتا تو اس کے حسن میں اور اضافہ ہوتا۔ قیمت بہت زیادہ ہے۔

کتابیں ہیں چمن اپنا

- مصنف: عبدالمجید قریشی • ناشر: ہمدرد فاؤنڈیشن۔ ناظم آباد۔ کراچی۔
- قیمت: ۷۵ روپے • تبصرہ: ادارہ

ابتداء میں ایک شعر درج ہے سے

سیاحت کا جنھیں ہے شوق، پھرتے ہیں وہ شہروں میں ؛ کتب بینی ہے سیر اپنی، کتابیں ہیں چمن اپنا

مصنف نے اس کتاب میں اس شعر کی تفسیر سچ کر دکھاتی ہے۔ یہ اُن کے چند مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو انھوں نے وقتاً فوقتاً تحریر کیے۔ یہ مضامین اگرچہ سرسری انداز میں، اور کسی حد تک رواروی میں لکھے ہوئے ہیں، یعنی ان میں کوئی خاص تحقیق یا تنقید کا عنصر نہیں، مطالعے کے دوران جو کتابیں سامنے آئیں، ان کا احوال رقم کر دیا۔ مگر اس کے باوجود یہ کتاب اس لئے اہم ہے کہ اس کے آئینے میں کئی بڑی شخصیات کے چہرے اور مرورِ ایام کے بہت سے عکس دکھائی دے جاتے ہیں۔ بعض کتابوں کے حصول میں مصنف کو جتنا تردّد کرنا پڑا، وہ بھی اپنے طور پر ادبی لگن کی ذیل میں آتا ہے۔

ہمدرد فاؤنڈیشن نے یہ کتاب شائع کی ہے۔ کاغذ اگرچہ سفید ہے مگر کتابت اتنی اچھی نہیں جو ہمدرد کی مطبوعات کا خاصہ ہوتا ہے۔ تاہم یہ ایسی کتاب ہے جو ذوق و شوق سے پڑھی جائے گی۔

دسترس کی دُوری

- شاعر: سعید ظفر • ناشر: کے کے پبلشرز۔ لاہور
- قیمت: ۱۵۰ روپے • تبصرہ: ادارہ

نوجوان نسل میں اب یہ احساس قوت پکڑ رہا ہے کہ ادب میں زندہ رہنے کے لئے اعلیٰ سرکاری افسری وجہ افتخار نہیں رہی۔ ایک زمانہ تھا کہ نقادوں سے لے کر رسائل کے مدیران تک انہی کے گن گاتے تھے۔ اور ان کے اوصاف گن گن کر نہیں تھکتے تھے۔

اب سرکاری افسر بھی عہدے کا گھمنڈ اور پبلک ریلیشنگ کی بجائے فن کو نکھارنے اور سنوارنے پر محنت کرتے ہیں۔

سعید ظفر نوجوان شاعر ہیں اور اتفاق سے اعلیٰ افسر بھی ۔ جبھی انھوں نے یہ شعر کہا ہے ؎

ہر لمحہ یاد رکھنا مزدور موسموں کو ! ؏ دیکھو سعید خود کو افسر نہ ہونے دینا

اور اس شعر میں بھی کسی حد تک اُس احساس کی بازگشت معلوم ہوتی ہے ۔

؎ جدائیوں میں نہ خود کو وقفِ عذاب کرتے ؏ اسیر ہوتے تو ترے غم کو شراب کرتے

سعید ظفر ایسا شاعر ہے جس کے ہاں ہجر بھی ہے اور وصال بھی ۔ گہری سنجیدگی بھی ہے اور کھلنڈرا پن بھی ۔۔ کہیں وہ کہتا ہے ؎

اک نام ہے اک دیوانی کا اور دیواروں پہ لکھا ہے ؏ اک شہر ہے اک شہزادی کا اور اک گلفام سا لڑکا ہے

اور کہیں اس پر بے چارگی کی یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے ع (نظموں کے مصرعے ہیں)

- روشنیوں اور جسموں کے سیلاب سے دل کو • ہم بھی، کھینچتے ٹالتے، گھر لاتے ہیں !
- تنہا تنہا اپنے گھر کا تالا کھولنے کے معمول میں • دستک دینے کی عادت ہی بھول گئی

یُوں لگتا ہے شاعر ٹوٹ پھوٹ اور ہونے نہ ہونے کے کرب میں مبتلا ہے ۔ کبھی اس کی سوچیں جذبوں کو مہمیز کرتی ہیں اور وہ رنگوں، خوشبوؤں اور شہزادیوں کا ذکر کرنے لگتا ہے ۔ کبھی خدشے، نارسائی اور محرومی کے بوجھ تلے دبنے لگتے ہیں، تو وہ یُوں رو دیتا ہے ع

بچھڑنا ہے تو یادوں کا اہتمام نہ کر ! ؏ میں کیا کروں گا تری آخری نشانی بھی

"دسترس کی دوری" کی شاعری میں بوقلمونی ہے ۔ مزاج کے رنگوں کی قوس قزح ہے اور یہی سب کچھ سعید ظفر کو اپنے ہم عصروں اور دوسرے اردو شاعروں میں منفرد بناتا ہے ۔

دیوان

- شاعر : سلطان بن علی العویس • ترجمہ : ظہور احمد اظہر
- ناشر : سعدیہ پبلی کیشنز ۔ گلبرگ ۔ لاہور • قیمت : ۱۰۰ درہم ۔ ۶۰۰ روپے پاکستانی • تبصرہ : ادارہ

عربی شاعری کی یہ کتاب لاہور میں معروف ادیبہ حمیدہ جبین اور نغمہ نگار مسرور انور کی کوششوں سے چھپی ہے جس کا خوبصورت ترجمہ ظہور احمد اظہر نے کیا ہے ۔ چند مہینے پہلے لاہور کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں اس کتاب کی شاندار تقریبِ رونمائی بھی ہوئی تھی، جس میں متحدہ عرب امارات کے شاعر سلطان بن علی العویس نے خود بھی شرکت کی تھی ۔ تقریب میں موسیقی کا پروگرام بھی تھا ۔ اور شاعر کی ہال میں آمد پر ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر شوقیہ گانے والے بچوں نے استقبالیہ ترانہ گایا تھا جس کی دھن بخشی وزیر نے بنائی تھی اور وہ اس وقت آرکسٹرا کی ترتیب کے لئے خود بھی موجود تھے ۔ شاعر موصوف کو ہال میں لانے والے سیٹھ عابد تھے ۔ حمیدہ جبین، جمیل ملک اور مسرور انور نے استقبال کیا اور دوسرے لوگوں کے علاوہ امجد اسلام امجد نے بھی اظہارِ خیال کیا تھا ۔ اور یوں محسوس ہوا جیسے انھیں منتظمین نے اُسی وقت آمادہ کیا تھا ۔ اس تقریب میں میڈم

نور جہاں اور شمیم آرا بھی شریک تھیں۔ کچھ ادیب اور شاعر بھی تھے ـــ اپنی نوعیت کی یہ دلچسپ اور عجیب و غریب تقریب تھی۔
پاکستان میں شاید عربی شاعری کی یہ پہلی کتاب ہے۔ جس کا شاعر عہدِ حاضر میں موجود ہے۔ کتاب نہایت خوبصورت سفید کاغذ پہ عمدہ طباعت کتابت سے چھپی ہے۔ سرورق پہ مصوّر نے شاعر کی تصویر بنائی ہے۔ ابتداء میں مسرور انور کا قصیدہ ہے، جسے انھوں نے اظہارِ محبت کا نام دیا ہے۔ ایک اظہاریہ مترجم کا ہے اور دو تین ابتدائیے عرب شاعروں کے ہیں۔ یقیناً یہ وہاں کے معروف شاعر ہوں گے۔ انہی سے معلوم ہُوا کہ حاکم شارجہ صقر بن سلطان القاسمی بھی شاعر ہیں اور وہ شاعری کی محفلیں سجاتے رہتے ہیں۔ جہاں بقول عرب شاعر فواد احسن (ابتدائیہ نگار) سب شعراء حاکم شارجہ کو قصیدے سنتے اور وہ اپنے کلام سے نوازتے ہیں۔ وہیں سلطان العویس بھی شعر سناتے ہیں۔
عربی زبان و ادب کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ نہایت دلپذیر شاعری ہے۔ مگر متذکرہ بالا معاملات کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے یہ کتاب مخصوص اور غیر متعلق حلقے سے باہر نہیں نکل سکے گی۔ کتاب کا انتساب دیکھیں ـــ

اپنی محبوبہ کے نام

"تیرا دیدار ہمارے لئے اس دنیا میں وطن قرار پایا ہے۔ تو بھلا وہ کیونکر نعمتوں سے لطف اندوز ہو سکتا ہے، جس کا کوئی وطن ہی نہ ہو۔"

پہلی نظم محبت ہے ـــ ملاحظہ ہو۔ پانچویں مصرعے کے بعد بیان ہوتا ہے ع

محبّت دل سے لگ جاتی ہے۔ محبّت کا جذبہ ایک آنسو ہے، جو عالمِ وجد میں گرے تو بے مثال ہے۔
شبِ وصل کی صبح، محبت چمک جاتی ہے، محبّت آزمائشوں کے بعد کندن بنتی ہے۔
میری بے قراری پہ حیران نہ ہو، جذبۂ شوق یوں گرفت میں لیتا ہے، جیسے قرض خواہ مقروض کو۔

ایک اور نظم میں اظہار ہے ع

تو جسے پسند کرے اپنا سکتی ہے مگر تجھے کوئی ایسی آنکھ نہیں ملے گی جو میری آنکھوں کی طرح دیکھے۔

ایک اور نظم کی ابتدا ہے ـــ ع

تو ایک دن میرے ساتھیوں سے میری شاعری کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔
بھلا میرے پاس تیرے سوا کوئی اور شاعری بھی ہے ـــ

دلگداز جذبوں کی یہ عجیب دلسوز اور دلفگار شاعری ہے۔ جس میں وصل کی خوشبو بھی ہے اور جدائی کی لذّت بھی۔
کتاب کی قیمت سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب عام قاری کے لئے نہیں ـــ !

سخن سخن سُورج

• شاعر: عابد انصاری • ناشر: لالہ زار اکیڈیمی جناح کالونی۔ سمن آباد۔ لاہور

• قیمت: • تبصرہ: فرخندہ لودھی

ہر شاعر یا اس کی شاعری قومی اہمیت اور نوعیت کی نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی قاری کو یہ اُمید رکھنی چاہئے کہ ہر شعر کو عوامی اور پیغامی ہونا چاہیئے۔ نہ معلوم ہم لوگوں کو چیزوں کو اُن کی اصل اور بنیاد پہ رکھ کر دیکھنا کیوں نہیں آتا۔ اپنی اپنی عینک سے دیکھنا ہی شاید انسان کو دوسری مخلوقات سے ممیز کرتا ہے۔ ہم لکھنے والے سے اپنے توہمات کے تحت توقعات کرنے لگتے ہیں۔ اب یہ اہلیت اور مقدر تو صرف غالبؔ ہی کو ملا کہ "میں نے یہ جانا کہ شاید یہ بھی میرے دل میں ہے"

عابد انصاری کا مجموعۂ کلام "سخن سخن سورج" پچھلے دنوں میرے زیرِ مطالعہ رہا۔ جہاں تک الفاظ کی درو بست اور اوزان کا تعلق ہے۔ عابد انصاری کہیں ٹھوکر نہیں کھاتے۔ ہنرمندی اور چابکدستی نے اظہار کو اُن کے لئے سہل بنا دیا ہے۔ اور بہت سلیقے سے اپنی بات کہہ جاتے ہیں، جیسے ؎

زندگی جیسی بھی ہے عابدؔ علی! ٭ ساتھ اس کا دیجئے ہر حال میں

ملاحظہ کیجئے شاعر کا سبھاؤ۔ اُس نے زندگی جیسی پرپیچ حقیقت کو کس قدر سیدھے سبھاؤ باور کرایا ہے کہ اس جیسی نعمت کوئی نہیں، اور یہ سچ ہے کہ فرد زندگی کو جیئے گا تو جانے گا کہ اس کا مزا کیا ہے۔ کب کب کڑوی لگی، کہاں کہاں میٹھے موڑ آئے "سخن سخن سورج" کا شاعر قنوطیت کا مارا یاسیت پرست لکھاری نہیں۔ وہ زندگی سے محبت کا پیغام بر ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ عابد علی کا پیغامِ محبت اس گھن گرج کے ساتھ دوسروں تک نہ پہنچے۔ کیونکہ اظہار کے پیمانوں کا انتخاب شاعر نے اپنے مزاج اور طبیعت کے دھیمے پن کے حساب سے کیا ہے۔ سہلِ ممتنع کی بہت سی اچھی مثالوں کے ساتھ عابد علی نے اپنا غالباً پہلا دیوان عوام اور ناقدانِ ادب کے سامنے پیش کیا ہے۔ دھیمے لہجے کی ایک مثال دیکھئے:

؎ گھٹائیں لائیں جب موسم سہانے ٭ کمی اس کی لگی دل کو ستانے

شاعر اپنے عہد کی سفاکی کا بھی اسی انداز سے ذکر کرتا ہے۔

؎ خوف آنے لگا ہے سایوں سے ٭ گھر میں آسیب جب سے آ بیٹھے
آنکھیں ویراں دلوں میں سناٹے ٭ لوگ کیا شہر کو بنا بیٹھے

یہ دو اشعار اُس آشوب کا نوحہ ہیں جس میں ہم پاکستان میں بسنے والے کئی دہائیوں سے سانس لے رہے ہیں۔ اور کم و بیش ہر حساس شہری اس پُرآشوب ماحول سے واقف ہے اور خوف زدہ ہے۔ یہ سوال ذہنوں میں اُبھرتا رہتا ہے کہ نہ معلوم کیا ہونے والا ہے؟ کچھ ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اس خوف سے ماندی فضا میں رہتے ہوئے بھی عابد علی نے زندگی کو قابلِ قدر قرار دیا ہے۔

"سخن سخن سورج" کی شاعری بیمار ذہن کی غماض نہیں۔ یبوست زدگی سے اس کا دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ کسی دبے ہوئے درد کی کراہ نہیں۔ ہاں! ایک 'ہمدرد' کا کلام ہے۔ کہتے ہیں ؎

؎ جنھیں ملی ہے نظر اُن پہ خوب روشن ہے ٭ کہ دانہ دانہ ہے کھیتی، کرن کرن سُورج

اور ؏ انسانیت کا رشتہ ہے عابدؔ عظیم تر ٭ اصنام کب کے گر چکے نام و نشاں کے

اُمید و آرزو کے سنگم پہ کھڑا شاعر جب یہ کہتا ہے کہ

شہر کی پختہ سڑک، پگڈنڈیوں سے آملی ؎ اور بھی سکھ آئیں گے دو چار دن کی بات ہے

آئے گی بجلی گلی کوچوں کے دن پھر جائیں گے ؎ چار دن ہوگا چراغاں پھر اندھیری رات ہے

عابد علی نے نظم غزل اور ہائیکو تینوں اصناف پہ طبع آزمائی کی ہے اور کہیں بھی فنی اعتبار سے لغزش کا شکار نظر نہیں آتے ہائیکو پردیسی صنفِ سخن ہے۔ مگر سخن ور کے لئے ہر صنفِ سخن دری کے راستے فراہم کرتی ہے۔ ایک اور شعر حرفِ نظر کے لئے

وہ کبھی بھولے سے بھی آتا نہیں، پہ اُس کی یاد ؎ کیا مہکتی پھر رہی ہے آرزو کے شہر میں !

اللہ تعالیٰ کی 'حمد' کے سلسلے میں ایک شعر ملاحظہ ہو

اس کی شایانِ شان حرف عابد ؎ حمد جس سے بیاں ہو کب دیکھ

عابد انصاری روایت سے منسلک رہتے ہوئے نعتِ رسولِ مقبولؐ کہتے ہوئے ان کی ذات سے پھر ویسے ہی معجزے کے متمنّی ہیں۔

جہاں میں دورِ جہالت پھر آگیا ہے حضور ؎ اشارہ آپ کی انگشت کا قمر مانگے

بقول غالب میں بھی شاعر کو ولی سمجھتی ہوں۔ بادہ خواری ایک لعین لت ہے۔ تبھی غالب کو کہنا پڑا۔

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

تاہم میرے نزدیک شعراء کے بھی ولیوں کی طرح مختلف درجات ہیں۔ جیسے پورا ولی، پون ولی، آدھا یا چوتھائی ولی۔ اور بعض ولائت کی پہلی سیڑھی کو تکتے ہی دُہائی ڈال دیتے ہیں۔ پہنچ گئے سمجھی پا گئے۔ دنیا والو! ہم کو مانو... نہیں مانتے؟ لو... تابڑ توڑ شاعر دیئے چلا جاتا ہے۔ مارکیٹ میں بعض اُدباء کی کتابیں اس طرح برستی ہیں جیسے خشت باری ہو رہی ہو... یہ آئی... پھر آئی... ایک اور آئی۔

عابد انصاری کی قادر الکلامی کے تیور ایسے نہیں کہ لوگوں کو خشت باری کے خوف سے اپنے سر بچانے کا خدشہ لاحق ہو جائے۔

خواب میرا لباس

- شاعر: شاہین عبّاس
- ناشر: سالیڈیریٹی فورم آف رائٹرز۔ لاہور
- قیمت: ۷۰ روپے
- مبصّر: رحمان حفیظ

"خواب میرا لباس" نوجوان شاعر شاہین عبّاس کا اوّلین شعری مجموعہ ہے۔ کتاب سفید کاغذ پہ چھاپی گئی ہے اور مرشد کے چہار رنگ فکری سرورق سے مزّین ہے۔ ادبی دنیا میں شاہین عبّاس کے تعارف کا حوالہ اس کی خوبصورت غزل ہے۔ زیرِ نظر مجموعے میں اس کی ۷۶ غزلیات شامل ہیں۔

فکری اعتبار سے غزل سب سے خوبصورت صنفِ سخن ہے۔ اکثر نوجوان شعراء غزل گوئی ہی سے آغاز کرتے ہیں — شاہین عباس کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔

آج کی غزل میں خارجی مطالعے سے جنم لینے والے احساسات کو پیش کئے جانے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ لیکن شاہین بنیادی طور پر کربِ ذات کا شاعر ہے۔ اور یہ احساس اُس کی شاعری میں مختلف علامتوں اور ترکیبوں سے جا بجا اظہار پاتا

ہے۔
مجھے برہنہ کیا تھا جس نے ؏ وہ خواب میرا لباس کیوں ہے
مجبوریوں کی دُھن بھی لبوں سے لپٹ گئی ؏ محرومیوں کی لے میں بھی گانا پڑا مجھے

اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ شاعر اپنے گردوپیش سے غافل ہے۔ اس نے اپنی ذات کے گنبد میں کچھ روزن بھی رکھے ہوئے ہیں جن کی مدد سے تازہ ہوا میں بھی سانس لیتا ہے اور باہر کی دُنیا سے رابطہ بھی رکھتا ہے۔ لیکن اس کے لئے پہلا مسئلہ بھی تخریبِ ذات سے تحفّظ کی ضمانت حاصل کرنے کا ہے۔

"خواب میرا لباس" کے مطالعہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ شاعر نے کلاسیکی روایت کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اسے ساتھ لے کر چلتے ہوئے آج کے تقاضوں سے بھی انصاف کیا ہے۔

میں روشنی کے حوالے سے جانا جاتا ہوں ؏ مرا مقام تری چشمِ بے بصر میں نہیں
موجۂ حزن کی تحریر سے ڈر لگتا ہے ؏ شہر کو آج بھی شبگیر سے ڈر لگتا ہے

شاہین کی غزلوں میں عامیانہ پن نہیں، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ اُس نے اپنی عمر سے ذرا آگے کی شاعری کی ہے۔ اُس نے ذات، کائنات، عشق، فلسفہ اور دوسرے حوالوں سے بہت اچھے شعر کہے ہیں۔

اب ڈھونڈتا ہوں اُس کو بدن کے خمار میں ؏ اک شخص میری قید میں آکر کہاں گیا
پیکر جو بے مکان تھے قبروں میں جا بسے ؏ قصّے جو نا تمام تھے کتبوں سے آملے

شاہین عباس کی شاعری سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ غزل کے مزاج سے پورا تعارف رکھتا ہے۔ اکّا دکّا غزلیات میں قوافی اور بیان کے عیوب بھی موجود ہیں۔ لیکن مجموعی اعتبار سے مصرعے کی ساخت، الفاظ کی نشست اور زبان کی صفائی کے حوالے سے شاہین عباس کی شاعری اپنے ہم عمر شعراء کے مقابلے میں کہیں زیادہ قابلِ توجہ ہے اور غزل کے شائقین شاہین سے اور زیادہ توقعات رکھنے میں حق بجانب ہیں۔

تھل دریا

- مصنف: محمد فیروز شاہ • ناشر: تجدید اشاعت گھر۔ اسلام آباد / لاہور
- قیمت: ۱۰۰ روپے • تبصرہ نگار: عاصی کرنالی

"تھل دریا" محمد فیروز شاہ کی نثری تحریروں کا مجموعہ ہے۔ شعری مجموعوں میں یہ بات ہوتی ہے کہ ہم بہت سی غزلوں، نظموں کی گھپّوں کے اندر سے ایک ہیرا تلاش کر لیتے ہیں۔ ایک کلیدی خیال، ایک موضوع جس کے مہرے سے وہ ساری یکجا بندھی ہوتی ہے۔ نثر کی ایسی کتاب جس کے مختلف عنوانات ہوں، ہم کوئی رشتہ وحدت تلاش نہیں کر سکتے۔ لیکن "تھل دریا" میں مجھے موضوع کی وحدت کا ادراک ہوا اور یہ اس کتاب کی ایک بے مثال انفرادیت ہے۔ ان تمام بکھرے ہوئے، پھیلے ہوئے مختلف المزاج مضامین کا ایک ہی موضوع ہے اور وہ ہے سچ کی تلاش۔ آپ کسی بھی ادب پارے کو پڑھ لیجئے، اس کی زیریں لہر کے طور پر سچ جھلکاریں مارتا نظر آئے گا۔ محمد فیروز شاہ کی نثر اعلیٰ پایے کی تخلیقی کاوش ہے۔ اس میں جذبے کی لطافت، خیال کی صباحت اور احساس کی نجابت ہے اور تفکّر کی ثقاہت بھی۔

محمد فیروز شاہ کی نثر شعریت میں ملفوف ہے۔ لیکن یہ "شعری رنگینی" کسی پُرتکلف کوشش کی تعریف میں نہیں آتی۔ اس شعری نثر میں بے ساختگی اور والہانہ پن ہے۔

"تھل دریا" پڑھتے ہوئے یہ احساس نمایاں ہوتا ہے کہ محمد فیروز شاہ جدت پسند اور ایجاد طبع ادیب ہے۔ وہ خود نئی حیرت زا تراکیب، لفظی تراشتا ہے اور نثری ادب میں وقیع اضافے کرتا ہے۔ ان ایجاد کردہ ٹکڑوں میں تشبیہ، تمثیل اور استعارے کے نئے جہان آباد کر دیتا ہے۔ چند ایک مثالیں درج ذیل ہیں۔

لجپال روایت۔ صداقتوں کی خوشبو کے سفیر۔ گل رتیں۔ دکھ کی عالمگیریت۔ الم کا علم۔ شرمندگی کے مترادفات۔ صدق نصیب حروف۔ معاشرتی رویوں کی کھیپ۔ سرخرو سرشاریاں۔ تخلیقی کمک۔ تاثیر کی جاگیر۔ لفظ کی قبر۔ سماعتوں کی تتلیاں۔ سماعتوں کے قلعے تسخیر کرنا۔ بدصورتی کا جسم گھر سجے لفظوں کی قوس قزح۔ زمانوں کا تبرک۔ خوشبو بھری خواہش۔ خواب تما آرزو کا رزق۔ کشف دریچے۔ اکلاپے کی چادر۔ روشن جذبوں کی سفارت۔ نوجوان عبارتیں۔ درست لمحے (وغیرہ)

تھل دریا۔ محمد فیروز شاہ کے ایثار کی آئینہ دار کتاب ہے۔ اپنی بجائے دوسروں کے تذکرے میں ذہن و قلم کی توانائیاں صرف کرنا ایثار ہی تو ہے۔ آج کے خودغرض زمانے میں لوگ اپنی زندہ داری کے لئے دھڑا دھڑ اپنی تخلیقات کا انبار لگتے ہیں۔ لیکن فیروز شاہ بہت سے اہل قلم کی تصانیف پہ تبصرے کر کے ان کی حیاتِ ازلی کی افزونی .... کا کام کرتے ہیں۔ "دبستان میانوالی" کے ضمن میں ازمنۂ قدیم سے لمحاتِ موجود تک کی مختلف الحیثیات شخصیات کے ناموں اور کاموں کے نقوش ابھارتے ہیں۔ یہ سارا عمل ایثار پیشگی کے سوا اور کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب "تھل دریا" سچ کا ارضی صحیفہ ہے!

انجمنِ خیال

(خطوط)

دسمبر ۱۹۹۲ء کے "تخلیق" میں حسین شاہد نے قرۃ العین حیدر پر اپنے مضمون بہ عنوان "واحد غائب" میں ادبی ترقی پسندی اور انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کے بعض پہلوؤں پر بھی تنقیصی و تحسینی اظہار خیال کیا ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ خود ترقی پسند اہل قلم ترقی پسند نقطۂ نظر، ترقی پسند ادب، ترقی پسند تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا کھل کر تنقیدی جائزہ لیں تاکہ ان کی خوبیاں اور خامیاں پوری طرح سامنے آسکیں اور یوں خامیوں سے بچتے ہوئے خوبیوں کو مزید فروغ دیا جاسکے۔ پاکستان کے غیر ترقی پسند نقادوں نے ترقی پسندی پر جو تنقید لکھی ہے انھوں نے اس میں عام طور پر ترقی پسند نقطۂ نظر کو قصداً یا سہواً مسخ کر کے پیش کیا ہے۔ ترقی پسند ادب کے نقادوں میں شاید واحد مثال مظفر علی سیّد کی ہے جو اس کا صحیح فہم رکھتے ہوئے اس پر تنقید کرتے ہیں۔ مگر انھیں محمد حسن عسکری اور انتظار حسین کے ساتھ دوستی کے باوجود غیر ترقی پسند نہیں کہا جاسکتا۔

حسین شاہد نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ

"ترقی پسند تحریک تو اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسانی تاریخ۔ جس دن ترقی پسند تحریک ختم ہوگئی وہ دن دنیا کا آخری دن ہوگا۔" (ص ۱۱۳)

ان کے خیال میں انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان

"کی سب سے بڑی غلطی وہ قرارداد تھی جو ۱۹۴۹ء میں پاس کی گئی اور جس کی وجہ سے ان لکھنے والوں کو اپنے جرائد میں نہ چھاپنے کا فیصلہ ہوا جنھیں تنظیم ترقی پسند نہیں سمجھتی تھی۔"

ان کا اس قرارداد پہ اعتراض یہ ہے کہ

"ترقی پسند ادب لکھنے کے لئے کسی تنظیم کی رکنیت یا اس کے ساتھ فکری اشتراک کیوں کر ضروری ہوسکتا ہے؟ یہ قرارداد پاس کر کے انجمن اپنے آپ کو جماعت اسلامی کی سطح پر لے آتی تھی جو ان دنوں نسلی مسلمانوں میں سے اصلی مسلمانوں کو چھانٹ کر الگ کرنے میں مصروف تھی۔" (ص ۱۱۳)

یہ درست ہے کہ جس طرح مسلمان ہونے کے لئے جماعت اسلامی کا رکن یا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تنظیم اپنے عقائد و نظریات کے لحاظ سے مسلمانوں کا محض ایک فرقہ ہے۔ اسی طرح ترقی پسند ہونے یا ترقی پسند ادب لکھنے کے لئے انجمن ترقی پسند مصنفین کی رکنیت ضروری نہیں تھی۔

انجمن سے باہر رہ کر بھی ترقی پسند رہا اور ترقی پسند ادب لکھا جا سکتا تھا۔ اور ایسا ہوا بھی۔ لیکن کوئی انجمن کا رکن تھا یا نہیں۔ ترقی پسند ادیب ہونے کے لئے ترقی پسند نظریات (آئیڈیالوجی) پر مجموعی طور پر باہمی اشتراک اُس وقت بھی ضروری تھا اور آج بھی ضروری ہے ورنہ ترقی پسند اور غیر ترقی پسند میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ ہاں اس پر بات ہو سکتی ہے کہ انجمن نے ترقی پسندی کا جو معیار قائم کیا، اس میں مزید وسعت پیدا کرنے کی گنجائش تھی یا نہیں۔ اور وہ کون کون سے اہلِ قلم تھے جو معروف معنی میں غیر ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی اپنی روشن خیالی اور لبرل ازم کی وجہ سے ترقی پسندوں کے ساتھی بن سکتے تھے۔

جہاں تک رجعت پسند ادیبوں اور رسالوں کے مقاطعہ کی قرارداد کا تعلق ہے۔ اس کے دو اجزاء ہیں۔ ایک یہ کہ رجعت پسند ادیبوں کو ترقی پسند رسالوں میں نہ چھاپا جائے۔ دوسرا یہ کہ رجعت پسند رسالوں میں ترقی پسند ادیب نہ چھپیں۔ ۱۹۴۹ء کی صورتِ حال میں قرارداد کا پہلا جز اصولی طور پر درست تھا کہ ترقی پسند رسالوں کو ترقی پسند تحریروں ہی کا حامل ہونا چاہئے اور یہ ان کا جمہوری حق تھا۔ اس جز میں غلطی یہ نہیں تھی کہ ترقی پسند رسالوں کو ترقی پسندوں کے لئے مخصوص کیا گیا بلکہ خرابی یہ تھی کہ ترقی پسند رسائل انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کی ملکیت نہیں تھے، یہ رسائل تنظیم کی بجائے بعض ترقی پسندوں یا ان کے ہمدردوں کی انفرادی ملکیت میں تھے جو ریاستی دباؤ کو برداشت نہ کر سکے۔ قرارداد کا دوسرا جز صریحاً غیر حقیقت پسندانہ تھا، کیونکہ ترقی پسندوں کے رسائل تو چند ایک تھے اور وہ بھی انفرادی ملکیت میں۔ جب کہ غیر ترقی پسند رسائل زیادہ تھے۔ یوں غیر ترقی پسند رسائل میں ترقی پسند ادیبوں کے چھپنے پر پابندی لگا کر ترقی پسند تحریروں کی اشاعت کو محدود تر کر لیا گیا۔ قرارداد کے اس دوسرے جز کی تحدید نے ترقی پسندوں کو زیادہ نقصان پہنچایا۔

کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کانفرنس ۱۹۴۹ء میں ایک اہم قرارداد زبانوں کے بارے میں بھی منظور کی گئی تھی جس پر غیر ترقی پسندوں کے ساتھ میرزا ادیب جیسے بعض ترقی پسندوں نے بھی بہت شور مچایا۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس قرارداد میں پیش کئے گئے نقطۂ نظر اور مطالبے کی حقیقت پسندی روشن سے روشن تر ہوتی جا رہی ہے اور عملی طور پر بھی اس میں پیش قدمی ہوئی ہے۔ اس قرارداد کے الفاظ تو سامنے نہیں ہیں۔ کانفرنس کی رپورٹ مشمولہ سویرا نمبر ۸۔۷ کے مطابق

> "زبان کے بارے میں کانفرنس نے ایک سائنٹیفک نقطۂ نظر پیش کیا۔ یعنی پاکستان میں تعلیم پاکستان کی مختلف قومیتوں۔ بنگالی۔ سندھی۔ پشتو۔ پنجابی اور بلوچی۔ کی زبانوں میں ہو۔ ان تمام زبانوں کو پاکستان کی ریاستی زبان کا درجہ دیا جائے اور اردو کے پہلو بہ پہلو ان کی ترقی اور ترویج کا بھی انتظام کیا جائے۔ بدقسمتی سے ترقی پسند ادب کی تحریک ابھی تک زیادہ تر اردو لکھنے والوں تک محدود رہی ہے گو پاکستان کے ترقی پسند ادیبوں کی بہت بڑی اکثریت کی مادری زبان پنجابی، پشتو، بنگالی یا سندھی ہے لیکن وہ ان زبانوں میں لکھنا عار سمجھتے ہیں۔ اُردو میں خوب لکھئے اس کو فروغ دینے کی پوری کوشش کیجئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ سمجھ لیجئے کہ جب تک آپ اپنی قومی زبانوں میں نہ لکھیں گے، آپ کی تحریک شہری حلقوں تک محدود رہے گی۔ عوام میں جڑ نہیں پکڑ سکے گی۔ ان کے مزاج اور ان کے دل کی دھڑکنوں سے محروم رہے گی۔ آپ کی تحریریں ان کے دلوں کو گرما نہیں سکیں گی۔" (ص ۲۴۵)

یوسف حسن۔ راولپنڈی

پیارے اظہر جاوید

تمہارا 'تخلیق' باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ اس بار اس نے بڑی راہ دکھائی۔ میں اسے اوّل تا آخر یعنی فٹ نوٹس سے قارئین کے خطوط تک بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ بڑا LIVELY جاندار میگزین ہے۔

کراچی میں تم ملے تھے تو تم "تخلیق" کے بارے میں کافی MODEST تھے۔ حالانکہ تمہیں MODEST ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ یہ اتنا ہی اچھا۔ ریڈیبل مواد سے بھرا میگزین ہے جتنا کوئی اور۔ ویسے اس کی کتابت سے بہتر کتابت میں خود کر سکتا ہوں (میرا یہ خط اس کا ثبوت ہے)

"فٹ نوٹس" حسبِ معمول نوکیلے اور تیکھے ہیں۔ انھیں پینزیز (PENSES.) کہنا چاہئے (فرانسیسی اصطلاح ہے غالباً اور انگریزی میں مروّج)

ممتاز مفتی کی کہانی 'آف اینڈ آن' مجھے آف اینڈ آن کرتی رہی۔ مفتی نے ستّاسی برس کا ہونے کے بعد بھی کہانی کی کرافٹ پر اپنی گرفت قائم رکھی ہے (قابلِ ستائش بات ہے) باقی میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ ان کے اندر کا سور ہر وقت تھوتھنی نکالے کیوں بیٹھا رہتا ہے۔ کیا سور واقعی چلاؤں چلاؤں کرتے ہیں۔ میں نے سور کی آواز نہیں سُنی (یہ میں اپنی جنرل انفرمیشن کی خاطر جاننا چاہتا ہوں)

خالصتاً ادبی لحاظ سے 'تخلیق' کی بہترین چیز میری نظر میں 'پرانی فلمیں نئی فلمیں' ہے۔ جی دار سکھ دلیپ سنگھ کی لکھی ہوئی۔ دو تین ماہ ہوئے میں نے دلیپ کی ایک کہانی جو میرے حسبِ حال تھی (یعنی بوڑھوں کے بارے میں) 'اذکار' میں پڑھی تھی۔ جو مجھے ابھی تک نہیں بھولی۔ یہ سکھ 'یا سنگھ' لکھنا جانتا ہے!

سفرنامے بھی دلچسپی کے حامل ہیں۔ مگر ادبی تقاریب کی روئدادوں سے زیادہ بورنگ اور کوئی شے نہیں۔ اب یہ بات ٹھپ ہو جائے تو لکھنے والوں اور پڑھنے والوں دونوں کے حق میں مفید ہوگا۔

اور ایسے سفرناموں کے لئے ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ انھیں 'مہا یتے' کیوں نہ کہا جائے؟

قارئین کے خطوط میں بے چارے ستار طاہر کی اچھی خاصی خبر یار لوگوں نے لے ڈالی ہے۔ خیر تم اپنے رسالے کے صفحات حق پرستوں (RIGHTISTS.) اور باطل پرستوں (LEFTISTS) دونوں کے لئے کھلے رکھتے ہو اور خندہ پیشانی سے دونوں کو اپنی اپنی بکنے کی کھلی چھٹی دیتے ہو۔ اچھی بات ہے۔

رحمان مذنب کے 'اعترافات' دلچسپ ہیں۔ میں نے ان کو کبھی نہیں پڑھا۔ (سوائے ان کی ایک کتاب 'سو سال زندہ رہنے کے') اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ ان کا عظیم ادیب ہونے کا دعویٰ کہاں تک درست ہے۔ ممکن ہے۔ وہ سعادت حسن منٹو سے زیادہ بڑے افسانہ نگار ہوں۔ بہر حال میں نے پہلی بار کسی لکھنے والے کو اپنی عظمت کو تسلیم کرنے میں جھجکتے ہوئے نہیں پایا۔

میں پچھلے چند ماہ سے اچھا خاصا علیل ہوں۔ بلڈ پریشر میں رکاوٹ کا عارضہ، آشوبِ چشم اور مستقل و پائیدار برانکائٹس۔

THIS IS ALL IN THE GAME, BROTHER.

کراچی پھر کب آنے کا ارادہ ہے؟

تمہارا

خالد۔ کراچی (محمد خالد اختر)

ڈیر اظہر جاوید صاحب، آداب

نیا سال مبارک ہو۔ اُمید ہے آپ نے گزشتہ شمارے میں لکھی ہوئی 'اپنی بات' پر نئے سال میں پوری طرح عمل پیرا ہونے کا پروگرام بنا لیا ہوگا۔

دسمبر کے شمارے میں نرجس بخاری کا مضمون 'پریم چند کی حقیقت نگاری' توجہ کا طالب ہے۔ انھوں نے پریم چند کی بعض تخلیقات اور بیانات کے علاوہ عبید اللّٰہ خان، پروفیسر قمر رئیس، اور سیّد ظہیر حسین عابدی کی تنقید کے حوالوں سے بھی حقیقت نگاری اور مثالیت پسندی پر اچھی بحث کی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس ضمن میں خود پریم چند بھی کہیں کہیں تضاد کا شکار ہوئے ہیں۔ 'بوڑھی کاکی' حقیقت پسندی سے آدرش واد (مثالیت پسندی) کی طرف سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اُس کی بہو رُوپا کا عام حالات میں ایک ہی لمحے میں سُدھر جانا ممکن نہیں تھا۔ اگر بوڑھی کاکی بھوک سے دم توڑ دیتی تب اس کی پشیمانی کی ایک صورت پیدا ہو سکتی تھی۔ کفن کہانی کے بارے میں ایک تاثر یہ بھی اُبھرتا ہے کہ پریم چند نے اپنے دو کرداروں گھیسو اور مادھو کو بالکل DEHUMANIZE کر دیا۔ حقیقت پسندی پر سراسر قنوطیت پسندی کا الزام دھرنا بھی غلط ہے۔ کفن کہانی کا آخری حصّہ جسے نرجس بخاری نے نظرانداز کر دیا ہے۔ سماج کے اسی رویے کی نشاندہی کرتا ہے جس پر مادھو اعتماد کرتے ہوئے کہتا ہے۔ جن لوگوں نے پہلے چندہ دیا۔ وہ پھر بھی ایسا کریں گے (کہانی کا اصل جملہ میرے سامنے نہیں ہے) اور یہی جملہ ساری کہانی کا کلائمکس قرار پاتا ہے۔

محترم ممتاز مفتی کی کہانی 'آن، آف' ان کی تخلیقی سنسنی خیزی کا آئینہ دار ہے۔ حمید اختر صاحب کی کہانی 'راز دان' ہمنگوے کے ناولٹ 'بوڑھا اور سمندر' کا ایک فکری تسلسل تو ہے۔ لیکن یہ ایک آزاد پیاری تخلیق کا درجہ رکھتی ہے۔ شمشاد احمد اور پروین راؤ کی کہانیاں بھی اچھی لگیں۔

الوز سرید کا سفرنامہ اور عبدالقوی ضیاء کی ادبی رپورٹ دونوں بخیر و خوبی اختتام پذیر ہو گئے۔ دونوں میں خاصی دلچسپی تھی۔

حسین شاہد ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔ اُنھوں نے قرۃ العین حیدر کے بارے میں مضمون 'واحد غائب' لکھ کر ایک بہت اچھے مبصّر ہونے کا ثبوت بھی فراہم کر دیا۔ مسعود منوّر کا ممنون ہوں کہ انھوں نے آٹھ برسوں کے بعد میرے سفرنامے 'خواب خواب سفر' پر ناروے کی ایک تقریب میں ۱۹۸۴ء میں پڑھے ہوئے مضمون کا دوبارہ مطالعہ کرنے کا موقع دے دیا۔ کوئی بھی تنقید مصنّف کو اس کے سیاق و سباق میں دیکھنے میں تو ممد ثابت ہوتی ہی ہے، ساتھ ساتھ خود نقّاد کے فکری نظام پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔

آپ کا مخلص

رام لعل۔ لکھنؤ

پیارے اظہر جی

دعائیں!

مطلوبہ پرچے مل گئے۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ نے بہت زحمت کی۔ آپ کے ہاں تو ہم نے جب جھانکا، شیدائیوں کا اتنا ہجوم پایا کہ آپ کے لئے اُن میں سے خود کو بھی چھانٹ کر الگ کرنا اور ڈھونڈھنا خاصہ مشکل ہو جاتا ہوگا۔ حیران ہوں یہ پُرانے پرچے کیونکر تلاش کئے ہوں گے۔ اُسی روز آپ کے ہاں ہمدم دیرینہ حمید اختر اور ڈاکٹر طاہر گورسے سے مل کر جی بہت خوش ہوا۔ تکرار کہ میں نے یہ کانٹا چھُو دیا ہے کہ چہار سُو۔ ابھی تک اظہر جاوید کو نہیں ملا۔ تفو بر تو چرخ گرداں تفو۔ اب صرف

پرچہ آپ کو ملے گا بلکہ گلزار جاوید خود بھی ملے گا ۔ دست بستہ ۔ آپ کی گلی کا نام تبدیل ہوگیا ۔ یار لوگوں نے "بھگوان" کو مسلمان کر کے رحمان کر لیا ۔

بھگوان گلی جو تھی وہ رحمان گلی ہے
اینا شی چندر جو تھا وہ اب سبطِ علی ہے

تمہارا اپنا ضمیر

برادر عزیز ۔ تسلیمات ۔

تخلیق کا تازہ شمارہ بلا سرورق کے رنگ و روپ سے اس کی داخلی صحت کا اندازہ ہوا ۔ آپ کا اداریہ جتنا مختصر تھا اتنا ہی تہہ دار بھی ۔ موجودہ دور میں لفظ جتنا تہہ دار ہوتا جاتا ہے ، اتنا ہی مہلک بھی ۔ میں اسی حوالے سے دوستوں کی محفل میں کچھ باتیں کرنا چاہوں گا ۔ انتہائی اختصار اور معذرت کے ساتھ ۔

دوستوں کے حلقے میں عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ 'تخلیق' کا مزاج خاصا معتدل ہے ، اور موسموں کے تغیر و تبدل سے بہت کم متاثر ہوتا ہے ۔ متلون مزاجی کے دور میں ایسی رائے اہمیت رکھتی ہے ۔ میں ایک عرصے سے تخلیق اعزازی طور پر پڑھ رہا ہوں ، اور سچ تو یہ ہے کہ اسے ہمیشہ مرنجاں مرنج پایا ۔ غالباً رسالہ اپنے مدیر کی متوازن اور 'صلح کن باخاص و عام' والی پالیسی کی عکاسی کرتا ہے ۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ تمام مکاتبِ فکر کو اپنے دامن میں برابر کی جگہ دیتا ہے ۔ یہ اچھی بات ہے کیونکہ اختلاف رائے علم اور فکر کو توانائی ملتی ہے ۔ حضور رسالتمآبؐ نے فرمایا ہے کہ اختلاف رائے امت کے لئے باعثِ برکت ہے ۔ لیکن اختلاف اسی صورت باعث خیر و برکت ہو سکتا ہے جب فریقین افہام و تفہیم کی صحت مند فضا میں سانس لے رہے ہوں اور کسی ادبی مسئلہ کو ذاتی مسئلہ نہ بنائیں ۔ ورنہ فضا اس قدر بوجھل ہو جاتی ہے کہ اس میں سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے ۔ یوں بھی آجکل ماحولیات کی زہر آلودگی کم کرنے کے لئے بین الاقوامی سطح پر بہت کام ہو رہا ہے ۔ . . . .

. . . . سنا ہے ہماری حکومت بھی اس سلسلہ میں بہت مفید کام کرنے کا ارادہ رکھتی ہے ۔ دراصل میرا خط بھی اسی پروگرام کا ایک حصّہ ہے ۔ میں خود ان دنوں اپنی بیکاری کا بیشتر حصہ دہلی و ہانوی کے ناول پڑھنے یا دھوپ میں بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے میں صرف کرتا ہوں ۔ نتیجہ خاطر خواہ رہا ہے ۔ اب میں منٹو ، عصمت اور رحمان مذنب کو زیادہ بہتر سمجھنے لگا ہوں ۔ مصحفی ناسخ ۔ سودا اور انشاء اللہ خان انشاء کو پڑھ کر چھوٹی موٹی لڑائیوں سے میرا ایمان اٹھ گیا ہے ۔ جی چاہتا ہے کہ زور کا رن پڑے اور پھر تعمیر نو کا عمل شروع ہو جائے ۔ سنا ہے پوسٹ وار جاپان اور جرمنی میں انڈسٹری اور عیاشی میں بہت اضافہ ہوا ہے کیا ہمارے ادبی معرکے اتنے ہی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے ؟

اس جملہ غیر معترضہ سے آپ کو یہ اندازہ تو ہو گیا ہو گا کہ میں کتنی سوچ بچار اور ہیومن ازم کے جذبے سے سرشار ہو کر یہ خط لکھ رہا ہوں ۔ میں تخلیق کا ایک نہایت مخلص قاری ہوں ۔ میری ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ تخلیق اپنے مشن کو (جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے) اسی خوش اسلوبی اور دیانت سے پورا کرتا رہے ، جو پہلے دن سے اس کا نشانِ امتیاز رہا ہے ۔ لڑائی جھگڑے میں کبھی کبھی شامل ہو جانا تو اچھا رہتا ہے کیونکہ اس سے ذہن کا زنگ اور جسم کی کسل مندی دور ہو جاتی ہے ۔ لیکن مستقل

طور پر محاذِ جنگ پر رہنا فوج کی پیشہ ورانہ صلاحیت کو کم کر دیتا ہے۔ یہ عرض داشت صرف آپ کے لئے ہی نہیں بلکہ ان تمام دوستوں کے لئے ہے جو عرصہ سے محاذِ جنگ پر ہیں ؎ میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔

تخلیق عام طور پر موسمِ بہار کی نوید ہوتا ہے۔ لیکن پچھلے ایک دو شمارے موسم کی گرمی سے کچھ متاثرہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب باہر کا موسم ناخوشگوار ہو گا تو وہ انتہائی محتاط اور ثقہ حضرات کو بھی متاثر کرے گا۔ شاید یہی حادثہ ستار طاہر اور ان دوستوں کے ساتھ ہوا جنھوں نے اپنے ردِ عمل کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ یہ ساری تحریریں پڑھ کر مجھے اس حد تک تو فائدہ پہنچا ہے کہ میرا بلڈ پریشر بہتر ہو گیا ہے۔ یہ ضعیفی کی وجہ سے بہت نیچے چلا گیا تھا۔ لیکن میں مفادِ عامہ کو ذاتی صحت کی خاطر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس لئے کچھ معروضات انتہائی ادب سے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پچھلے ایک دو شماروں میں ستار طاہر صاحب نے اپنے فٹ نوٹس میں اپنی روش سے ہٹ کر ایسا انداز اختیار کیا ہے جس سے ان کا علمی وقار مجروح ہوا ہے۔ میرا شمار ستار طاہر کے مداحوں میں ہوتا ہے اور اس کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ گرچہ میں اُن سے کبھی ملا نہیں لیکن غائبانہ طور پر ان کی علمی وجاہت کا بہت معترف ہوں۔ وہ اپنے مطالعہ کی وسعت سے ہم جیسے مطالعہ گریز لوگوں کے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ اور یہ کام بہت نیک ہے۔ اگر وہ چھوٹے موٹے معاصر تنازعوں سے بلند رہ کر اپنے اصلی مشن کو جاری رکھ سکیں۔ تو تخلیق کے قارئین کو بہت خوشی ہوگی۔ اس کے علاوہ اگر قارئین کرام جو احباب کی بزم میں شریک ہوتے ہیں، خطوط لکھتے وقت روشنائی میں تھوڑی سی چینی یا گلوکوز ملا لیں تو وہی خطوط جن پر تلخی غالب آجاتی ہے زیادہ میٹھے اور دلپذیر ہو جائیں گے
بقول غالب ؎ کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب ؛ گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔ والسلام

غلام جیلانی اصغر۔ سرگودھا

جانِ درویش! السلام علیکم!

'تخلیق' دسمبر ۹۲ کا شمارہ مل گیا ہے۔ شکریہ۔ ایک بالکل نئی کہانی "پھر جلنے کا موسم" ارسال کر رہا ہوں۔ تخلیق کے قارئین کو ضرور پسند آئے گی.... اس دفعہ کہانی ٹائپ کر کے بھجوا رہا ہوں لیکن ٹائپ کی کوالٹی انتہائی مفلس اور پسماندہ سی ہے۔ کاتب کو کافی محنت کرنا پڑے گی۔

میں نے تنبال شمشاد احمد کی کہانی "پہلا آدمی" پڑھی ہے۔ کہانی پڑھ کر لطف آگیا۔ لیکن نہ جانے مجھے ایسے کیوں لگا کہ کردار پہلے تخلیق کر لئے گئے ہیں۔ اور کہانی بعد میں لکھی گئی ہے۔

'آن' 'آف' میں ممتاز مفتی آجکل عمر کے آخری حصہ میں کچھ کہانیاں صرف انڈر ویئر پہن کر لکھ رہے ہیں۔ اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں ارشمیدس کی طرح کسی روز وہ بھی کسی حقیقت کو پالینے کی خوشی میں بازاروں میں الف ہو جائیں۔

انور سدید کا سفر نامہ "دلی درشن" اس لئے نہیں پڑھا اور نہ ہی پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ بابری مسجد کی شہادت کا لہو ابھی آنکھوں کے سامنے ہے۔

"اپنی بات" لکھتے رہو۔ یہ مت سوچا کرو میرے بھائی کہ سینئرز آنے والی نسلوں کو کیا دے رہے ہیں۔ چند بحثیں۔ مناظرے۔ ادبی نورا کشتیاں۔'

آخری خبر یہ ہے کہ میرا تبادلہ فیصل آباد ہو گیا ہے ـ یوں بھی ہوتا ہے۔ بہرحال میرے حصے کا شمارہ میرے راولپنڈی والے ایڈریس پہ ارسال کر دیا کریں۔

خدا میرے بھائی کو ایک طویل عمر بمعہ صحت کاملہ کے عطا کرے۔ آپ کا ـ شمس نعمان۔ راولپنڈی

مکرمی جناب اظہر جاوید آداب!

آپ کا ماہنامہ "تخلیق" کبھی کبھار نظروں سے گزرتا ہے۔ اس بار جو نظر پڑی تو نگاہوں سے چپک کر رہ گیا۔ سارا رسالہ پڑھ ڈالا، بے اختیار دل کی گہرائیوں سے تعریف نکلی۔ یوں باقاعدگی سے ہر ماہ معیاری ادبی رسالہ نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ـ اس مسلسل محنت اور لگن پر میری طرف سے مبارکباد قبول کریں۔

اس ماہ میں خاص طور پہ قابلِ ذکر ممتاز مفتی کا افسانہ "آن، آف" تھا۔ یہ افسانہ ہم اس سے پہلے مفتی صاحب کی زبانی حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد میں بھی سن چکے تھے۔ اچھا دلچسپ افسانہ ہے، پڑھتے ہوئے دل میں گدگدی سی ہونے لگتی ہے اور پھر پڑھتے ہوئے کئی بار چور انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھنا کہ کوئی اور تو نہیں سُن رہا... یہی اس افسانے کا دلچسپ پہلو ہے۔

فقط طالب دعا نصیرا احمد۔ اسلام آباد

مکرمی محترمی۔ پیارے اظہر جاوید صاحب!

سلام خلوص۔ ماہ دسمبر ۹۲ کا تخلیق ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ نے مجھے یاد رکھا۔ "اپنی بات" کے زیرعنوان آپ کی تحریر دلنواز ہے۔ کہتے ہیں محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ میں نے کبھی جنگ نہیں کی۔ ٹھیک ہے آپ محبت کرتے ہیں۔ آپ کی شخصیت کا جواب نہیں کہ گالیاں دینے والوں سے بھی محبت کرتے ہیں۔ آپ بڑے آدمی ہیں کہ آپ نے تخلیق میں شہرت یافتہ بڑے قلم کاروں کو بڑے بڑے احترام سے سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔ تخلیق میں ان کی جانب سے ایک دوسرے کو بڑی بڑی گالیاں دینے کا حق دیجئے کہ بڑے لوگ اصل میں ہوتے ہی وہ ہیں جو ایک دوسرے کے منہ پر تھوکیں اور گالیاں دیں کہ بڑے ادیب کی شان ہی یہی ہوتی ہے۔ حصۂ نظم اور افسانے بہت بھاری ہیں لیکن افسانوں اور غزلیات کا بہت اچھا تأثر ذہن سے دھواں بن کر اڑ گیا کہ انجمن خیال اور دیگر سب کچھ نثر کے حصوں میں اتنی تلخیاں آتی ہیں کہ گالیاں دینے والوں کی جانب دھیان یوں جاتا ہے کہ ان کو دعائیں دیتے رہیں اور غزلیات افسانے سب بھول جائیں ـ کہ اصل میں بڑا ادیب ہوتا ہی وہ ہے جو ہر دوسرے ادیب کو کھُل کر گالیاں دے۔ آپ آئندہ تخلیق کا گالی نمبر بھی شائع کریں۔ خدا آپ کو بھی کسی انعام سے نوازے گا کہ آپ بڑے ادیب کے منہ سے نکلی ہوئی گالیاں تخلیق میں احترام سے شائع کریں تاکہ آئندہ کا تاریخ دان آپ کا بہت احترام سے ذکر کرے کہ گالیاں تخلیق کی زینت ہوں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ آپ کا نام بھی سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ اظہر جاوید صاحب خدا آپ کو ادائے خیر سے نوازے۔

والسلام اکبر کاظمی۔ لاہور

برادرم اظہر جاوید! السلام علیکم

ہندوستانی مندوب کرشنا مینن نے یو۔ این۔ او میں تقریر کرتے ہوئے پرتگالیوں کی موجودہ نسل کو اُن ہندوستانیوں کی اولاد کہا تھا جنھیں پرتگالی ہندوستان سے پکڑ کر لے گئے تھے۔ اس پہ احتجاج ہوا اور کرشنا مینن کے الفاظ کارروائی سے حذف کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ لیکن پرتگالی مندوب نے کہا کہ الفاظ حذف نہ کئے جائیں تاکہ ہندوستانیوں کی پست ذہنیت کا ثبوت رہتی دنیا تک یو۔ این۔ او کے ریکارڈ میں موجود رہے۔ آپ نے اس دفعہ "اپنی بات" سیاہی کی بجائے آنسوؤں سے لکھنا گوارا کرلی ہے لیکن جناب ستار طاہر کے "فٹ نوٹس" نمبر 9-10 حذف نہ کرکے جناب ستار طاہر کو وہ تمغۂ حسنِ تحریر عطا کر دیا ہے جس کی "چمک" رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ ستار طاہر صاحب ہمیشہ کے لئے طالب علم بنے رہنے پر کیوں مصر ہیں۔ اُن کی نفسیاتی پرابلم کیا ہے۔ متذکرہ فٹ نوٹس میں اُنھوں نے خود ہی اپنی "طالب علمی" کا راز افشا کر دیا ہے "جذباتی تعلیم" حاصل کرنا ان کی "مجبوری" بن چکی ہے یہ ایسی مجبوری ہے جس سے موت ہی چھٹکارا دلا سکتی ہے۔ اس مجبوری کا حامل طالب علم جب تک جذباتی تعلیم کا سبق حاصل نہ کرلے اس کی بے چینی دُور نہیں ہو سکتی۔ ستار طاہر صاحب کی چشمِ احتیاج اب انجم نیازی پر پڑی ہے اور وہ ان سے جذباتی تعلیم حاصل کرنے کے آرزومند ہیں۔ یہ درست ہے کہ انجم نیازی پٹھان ہے اور اکثر پٹھان اساتذہ طالب علموں کو جذباتی تعلیم دینے کے ماہر ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں ستار طاہر صاحب سے بھول ہوتی ہے۔ انجم نیازی بے چارہ ان کی مجبوری کیسے دُور کر سکتا ہے۔ اس کے محکمہ کے لوگ اور متعلقین اس کی درویشِ طبعی سے نالاں ہیں کہ نہ وہ حرام خوری کرتا ہے اور نہ کسی کو کرنے دیتا ہے۔ وہ پابندِ صوم و صلوٰۃ اور پرہیزگار شخص اپنی منصبی مصروفیات سے فارغ اوقات میں حمد، نعت، سلام اور منقبت کہنے میں مصروف رہتا ہے۔ نانِ جویں پر گزارہ کرکے اپنی عمر بھر کی حلال تنخواہ سے پس انداز کی ہوئی پونجی صرف کرکے خاکِ درِ حبیبؐ کو چومنے کی اپنی سب سے بڑی آرزو پوری کرنے کے لئے اس بار حج کو جا رہا ہے۔ وہ ستار طاہر کی جذباتی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کیسے پوری کر سکتا ہے۔ اس کے لئے طالب علم جناب ستار طاہر کو کسی اور کے آگے تعظیماً جھکنا پڑے گا۔

ستار طاہر صاحب کا قلم ایک عرصہ سے "فٹ نوٹس" کے ذریعے ہر چھوٹے بڑے ادیب پر بے روک ٹوک سیاہی پھینکنے میں مصروف ہے۔ "تخلیق" کے گزشتہ تین چار شماروں میں اُنھیں آئینہ دکھایا گیا ہے تو وہ بلبلا اُٹھے ہیں اور ایسی زبان بولنے لگے ہیں جو "اُس بازار" کے باسی بھی نہیں بولتے۔ "تخلیق" کے گزشتہ شمارہ میں .... انھوں نے انور سدید اور سجاد نقوی کو "MUTE" یعنی "کتا" کہا اور موجودہ شمارے میں انجم نیازی سے "جذباتی تعلیم" حاصل کرنے کی درخواست کر رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اُن کا فکشن کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اور اُنھیں امریکن کونسلیٹ کی لائبریری والوں نے "THE BEST READER" کا سرٹیفکیٹ دے رکھا ہے۔ لیکن یہ سرٹیفکیٹ مہذب اور شائستہ انسان ہونے کا سرٹیفکیٹ تو نہیں ہے میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے "فٹ نوٹس" 9-10 شائع کرکے جناب ستار طاہر صاحب کو "THE DIRTIEST WRITER" کا سرٹیفکیٹ عطا کر دیا ہے۔ والسلام

نیاز مند

پرویز بزمی۔ لاہور

بھائی جان اظہر جاوید صاحب !

" تخلیق " کے شمارہ اکتوبر میں ستار طاہر صاحب فٹ نوٹس 29 اور ۳۰ میں لکھتے ہیں۔ چند سطریں نقل کر رہا ہوں " اگر تنویر ظہور صاحب کو واقعی اس 'جرم' میں زدوکوب کیا جاتا تو میں اس کے خلاف ضرور لکھتا لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ تنویر ظہور صاحب کو اس 'جرم' کی پاداش میں نہیں بلکہ کسی اور وجہ سے زدوکوب کیا گیا تھا۔" آگے چل کے لکھتے ہیں۔ " اسے کیا کہئے کہ بعض اوقات انسان بعض لوگوں کو اتنا مشتعل کر دیتے ہیں کہ وہ دوسرے کو پیٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں "

اظہر بھائی جان ! آپ کو علم ہی ہے کہ میں آپ کو دل و جان سے بھائی سمجھتا ہوں۔ آپ میرے محسن بھی ہیں۔ آپ کے مجھ پر ایک نہیں بے شمار احسانات ہیں۔ ایک بڑا احسان یہ کہ آپ نے میرا گھر ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچایا۔ بھائی جان آپ غور کریں۔ آپ نے اپنے رسالے میں میرے بارے میں جو جملے شائع کئے ہیں۔ وہ شائع ہونے چاہئیں تھے ؟ کیا ستار طاہر صاحب کے لکھے ہوئے جملے وحی کی حیثیت رکھتے ہیں ___ کہ انھیں ہو بہو شائع ہونا چاہئے تھا۔ پھر ستار طاہر صاحب نے خود ہی تو لکھا ہے کہ " بعض اوقات بعض لوگوں کو اتنا مشتعل کر دیتے ہیں کہ وہ دوسرے کو پیٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں "۔ کیا ستار طاہر صاحب اس کے لئے تیار ہیں۔ ستار طاہر صاحب نے لکھا ہے ___ " بول ! کہ لب آزاد ہیں تیرے " ! ___ میں لب نہیں کھولنا چاہتا تھا۔ میں تو فیض صاحب کی روایت پر عمل کرتے ہوئے خاموش رہنا چاہتا ہوں ___ مجھے کیوں اکسایا جا رہا ہے میں تو صوفی ہوں۔ الگ تھلگ بیٹھا خاموشی سے بال بچوں کا پیٹ پال رہا ہوں ___ !

لکیر پیٹنے سے کیا فائدہ ؟ جو ہونا تھا ہو چکا۔ کہتے ہیں کہ سب سے بڑی مچھلی وہ ہوتی ہے جو کانٹے سے نکل جائے سب سے بڑا شکار وہ ہوتا ہے جو ہاتھ سے نکل جائے۔ اور سب سے حسین عورت وہ ہوتی ہے جو ہاتھ نہ آسکے !

بھائی جان ! شکار ہی ہاتھ سے نکل گیا تو اب میں کیا کروں اور آپ کو کیا بتاؤں۔ آپ اچھے بڑے بھائی ہیں۔ ہمدردی کا اظہار کرنے کے بجائے اپنے پرچے میں میرے بارے میں اوٹ پٹانگ چھاپ دیا۔

حوصلہ کبھی نہیں پوچھتا کہ پتھریلی دیوار کتنی اونچی ہے ؟ ہر کوئی وہی کچھ دے سکتا ہے جو اس کے پاس ہے۔ اگر میں ناکام رہا ہوں تو یہ کسی اور کا نہیں بلکہ سراسر میرا اپنا قصور ہے۔ گولیاں اور تمغے ایک ہی چھاتی میں پیوست اور آویزاں ہوتے ہیں۔ میں صرف آپ کی خاطر حقیقتِ حال بیان کرنے لگا ہوں۔ میں نے اب تک بے شمار ادیبوں اور شاعروں کے انٹرویوز کئے ہیں جو اس اخبار میں شائع ہوتے رہے ہیں جس اخبار میں' میں نوکری کرتا ہوں۔ بطور صحافی مجھے یہ تو حق ہے کہ میں کسی بھی قسم کا سوال کروں مجھ سے یہ حق کوئی نہیں چھین سکتا۔ کچھ لوگوں نے مجھ سے یہ حق چھیننے کی کوشش کی۔ آپ بھی بلند پایہ صحافی ہیں۔ کیا آپ یہ حق چھیننے کو درست سمجھتے ہیں ؟ ان انٹرویوز میں سے ایک انٹرویو جناب شہزاد احمد کا بھی تھا جو کہ اخبار میں چھپا۔ شہزاد احمد صاحب سے میں نے ایک سوال یہ بھی پوچھا " س۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی ___ آپ کے خیال میں ان میں اچھا شاعر کون ہے ؟ " ___ " ج۔ بعض مقامات پر ڈاکٹر وزیر آغا کا پلہ بھاری ہے اور بعض مقامات پر احمد ندیم قاسمی کا۔ ڈاکٹر وزیر آغا زیادہ تر نظم لکھتے ہیں جس میں ان کا ایک خاص اسلوب ہے ___ اس طرح کی نظم ندیم صاحب نہیں لکھتے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی نظم کے موضوعات کا تعلق کائنات اور باطن سے ہے جبکہ ندیم صاحب کی نظم کا تعلق انسانیت پسندی سے ہے اور ان کے موضوعات معاشرتی ہیں۔

چونکہ دونوں حضرات کے موضوعات الگ ہیں اس لئے ان کی شاعری کا موازنہ کرنا بہت مشکل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ندیم صاحب کا تعلق ترقی پسند تحریک سے رہا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر وزیر آغا حلقہ ارباب ذوق سے تعلق رکھتے ہیں یہ دونوں مکاتب فکر اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں پھر یہ کہ ندیم صاحب نے اپنا انداز وقت کے ساتھ تبدیل کیا ہے اور انھوں نے اپنے آپ کو نئی تحریکوں سے الگ نہیں رکھا جو بہت بڑی بات ہے۔ آج تک صرف دو شخصیات ایسی سامنے آئی ہیں جنھوں نے یہ کام کیا ہے۔ ایک احمد ندیم قاسمی اور دوسرے احسان دانش۔"

اظہر جاوید صاحب! میں نے سوال اور اس کا جواب اس لئے نقل کر دیا ہے تاکہ آپ اس کا خود بھی اندازہ لگا سکیں کہ کیا اس میں سے خدانخواستہ ندیم صاحب کی توہین کا پہلو نکلتا ہے؟ اگر کوئی بات قابلِ اختلاف تھی بھی تو شہزاد صاحب سے پوچھا جاتا یا تحریری طور پر اس کا جواب دیا جاتا۔ مگر ہوا اس کے برعکس —

میں میکلوڈ روڈ پر اپنے دوست محمد حنیف صاحب کی دکان پر بیٹھا تھا کہ خالد احمد صاحب اور نجیب احمد صاحب وہاں تشریف لائے حنیف صاحب بے شمار ادیبوں کے دوست ہیں۔ انتہائی شریف، نیک، مخلص اور مرنجان مرنج انسان — وسیع مطالعہ کے مالک۔ تو نجیب صاحب نے کہا کہ تم جو وزیر آغا اور احمد ندیم صاحب کے حوالے سے پوچھتے ہو کہ ان میں سے اچھا شاعر کون ہے (انھوں نے شہزاد احمد صاحب کے انٹرویو کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بات کہی) تو کیا اس کام کے لئے تمہیں وزیر آغا پیسے دیتا ہے۔ کیونکہ جب تم ایک بڑے شاعر کا ایک غیر شاعر کے ساتھ موازنہ کرواؤ گے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ اس بحث میں تلخی بھی ہو گئی۔ میں اگلے روز احمد ندیم قاسمی صاحب کی خدمت میں (مجلسِ ترقی ادب کے دفتر) حاضر ہوا اور انھیں ساری صورتِ حال بیان کی بلکہ میں لکھ کر لے گیا تھا۔ ندیم صاحب نے فرمایا کہ میں نجیب احمد سے معلوم کروں گا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ منصورہ بی بی نے شہزاد احمد صاحب کے انٹرویو کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ "تنویر صاحب! آج کل آپ پھڈے بازی والے انٹرویو کر رہے ہیں"۔ میں کیونکہ خواتین کا بہت احترام کرتا ہوں۔ اس لئے بی بی کی بات مسکرا کر ٹال گیا۔

جب میں ندیم صاحب سے اجازت لے کر ان کے دفتر سے باہر نکلنے لگا۔ تو تین اشخاص ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک بزرگ اور دو جوان تھے۔ بہر کیف میں چلا گیا۔ باہر لان میں یونس جاوید صاحب (جو کہ اسی دفتر میں کام کرتے ہیں) کھڑے تھے انھوں نے پوچھا کہ خیریت ہے۔ کیسے آنا ہوا؟ میں نے گزشتہ شام پیش آنے والا واقعہ انھیں بیان کیا۔ اس دوران وہی تینوں اشخاص یعنی ایک بزرگ اور دو جوان، ندیم صاحب کے کمرے سے باہر نکلے۔ ان میں سے جو بزرگ تھے وہ میری طرف بڑھے۔ جوان نسبتاً کچھ فاصلے پر کھڑے رہے۔ ان بزرگ نے مجھ سے جو سوال کئے اور میں نے جو جواب دیئے۔ وہ میں لکھ رہا ہوں۔ انہی کی زبان میں —

س — اوئے تیرا ناں کیہہ اے؟

ج — جی تنویر ظہور

س — تیری تعلیم کیہہ اے؟

ج — بی اے

س — کرنا کیہہ اے؟

ج ــ جی میں صحافی آں ـ اک اخبار وچ کم کرناں ـــ

س ــ صحافی ! اوئے تو صحافی ایں ـ لکھنا آندا نہیں صحافی تے پھردے او شہزادا حمد دے انٹرویو وچ کیہہ چھپیا سی او ؟

ج ــ کیہہ جناب کوئی غلط سوال چھپیا گیا اے ؟

بزرگ ــ گریباں پکڑ کر اوئے ہینوں پچھنا اے غلط سوال ــ اوہ تیری ماں دی ـــ

اظہر بھائی جان ! اس کے آگے انھوں نے جو فرمایا وہ میں لکھ نہیں سکتا ـ میری ماں کو فوت ہوئے ۳۳ برس گزر چکے ہیں ـ آپ یونس جاوید صاحب سے پوچھ سکتے ہیں ـ وہ مجھے بچانے کے لئے آگے بڑھے تو ان بزرگ نے انھیں بھی دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا ـ جب وہ دل کھول کر بھڑاس نکال چکے تو پھر انھوں نے فرمایا !

" میرا ناں رشید ملک اے ـ جا جاکے پولیس وچ رپورٹ درج کرا دے میری کوئی ...."

اس کے بعد انھوں نے جو کہا وہ بھی لکھا نہیں جا سکتا ـــ

اظہر جاوید صاحب ! کیونکہ میں اس اچانک کارروائی کے بارے میں سوچ نہیں سکتا تھا ـ اس لئے جوابی کارروائی "نہ کر سکا ـ ورنہ میرا راجپوتی خون کھول رہا تھا ـ پھر اس بزرگ کے ساتھ آئے ہوئے دو جوان مجھے مسلسل گھور رہے تھے ـ کہ اگر اس نے جوابی کارروائی کی تو مجھے دبوچ لیں گے ـ

اظہر صاحب ! میں آپ کو قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس وقت میری عمر ۴۵ برس کی ہو گئی ہے ـ زندگی میں اس قسم کا واقعہ پہلی بار پیش آیا ـــ اور پھر یہ بھی پہلی بار ہوا کہ میں جواب میں کچھ کر نہیں سکا ـ جس کا مجھے مرتے دم تک افسوس رہے گا ـ آپ نے مجھے پرسہ بھی تو نہیں دیا ـ اچھے بھائی ہیں آپ ! ـــ خدا آپ کو خوش رکھے ـــ سدا خوش اور آپ کی لمبی حیاتی ہو !

آپ کی ہر دم خیر چاہنے والا ـــ فقیر تنویر ظہور ـــ لاہور

مکرمی اظہر جاوید صاحب ـ سلام مسنون !

"تخلیق" کا حالیہ شمارہ ملا ـ حسب معمول شکر گزار ہوں ـ آپ کا اداریہ پڑھا ـ اپنی تو سمجھ میں نہیں آیا ـ آپ نے دبی دبی زبان میں اشاروں کنایوں میں کیا بات کہہ دی ـ وہ ہمارے سر سے گزر گئی ـ لیکن اتنا ضرور محسوس ہوا کہ کوئی طوفان بروش قصہ چل رہا ہے ـ خدا کرے ہر طرح سے خیریت رہے ـ یہی حال ستار صاحب کے فٹ نوٹس کا ہوا ـ کون کس پہ کس کس طرح سے برس رہا ہے اور کون کس پہ کس طرح کی چوٹیں کر رہا ہے اور کیوں ؟ اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی ـ کیا یہ اچھا نہ ہو گا کہ ستار صاحب علمی ادبی بحث کو تفصیل سے لکھیں اور صرف اصولوں سے متعلق لکھیں ـــ

غلام جیلانی اصغر کی نظم اچھی ہے ـ لیکن مجھے ایسا لگا کہ وہ مفہوم کی تلاش میں نہیں فہم کی تلاش میں ہیں ـ حافظ لدھیانوی صاحب کی بھی نظم اچھی ہے ـ لیکن بعض مصرعے ناتراشیدہ ہیں ـ مثلاً برسوں کی سختی کی لکیریں ، بادِ تند کے ریلے ، وغیرہ ـ اسی طرح امینہ عنبرین کی دونوں نظمیں مزید توجہ چاہتی ہیں ـ زبان کے اعتبار سے ـ البتہ منیر پرویز کی دُعا رواں دواں ہے ـ

افسانے تمام ADOLESCENT ہیں غزلوں کا معیار بھی پست ہے مجشر بدایونی کے مطلع کا پہلا مصرع ہے ـــ

؎ جی لگے گا ملالوں میں بھی ___ یہ کیا زبان ہوئی ؟

انجمن خیال میں وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی، ستار طاہر صاحب اور دیگر اہل قلم حضرات کے درمیان جو کچھ کھینچا تانی ہو رہی ہے۔ اس کی تفصیلات سے میں ناواقف ہوں لیکن پتہ چلتا ہے کہ یہ گفتگو 'پارٹی بازی' کے انداز پہ ہو رہی ہے۔ ہر ہر شخص اپنے اپنے موقف کی شرح و بسط میں اپنے مخالف کی ٹانگ کھینچ رہا ہے۔

خالد بزمی صاحب نے مجھ سے یہ سوال کیا ہے کہ کیا ہر صدی کا تلفّظ مختلف ہوتا ہے؟ ناطقہ سر بہ گریباں ہے کہ اسے کیا کہئے بزمی صاحب نے یہ اصول کہاں سے اخذ کیا؟ تشکّل اور تشکُل کی بحث دراصل ہر ترقی پسند اور ترقی پذیر زبان میں پیش آتی رہی ہے انھیں یہ یاد دلاتا چلوں کہ جہاں تک اُردو میں دخیل الفاظ کا تعلق ہے چاہے وہ پراکرت، سنسکرت اور انگریزی سے آئے ہوں یا عربی و فارسی سے، اُردو نے ان میں صوتی، حرفی اور معنوی تصرفات وسیع پیمانے پر کئے ہیں۔ تلفظ کا اختلاف صوتی تصرف کے ذیل میں آتا ہے۔ اور یہ بات تو بزمی صاحب بھی مانتے ہوں گے کہ جب کوئی زبان دوسری زبان سے الفاظ قبول کرتی ہے تو انھیں اپنے لسانی مزاج میں ڈھال لیتی ہے (اس موضوع پر ڈاکٹر عصمت کی کتاب اُردو میں فارسی کے لسانی اثرات۔ تصرف کے آئینہ میں ملاحظہ ہو) دخیل الفاظ کے تلفّظ کے سلسلہ میں اردو زبان میں کئی گروہ بن گئے ہیں۔ اور اس تلفظ کے سلسلہ میں بڑا انتشار پیدا ہوگیا ہے۔ اس لئے اگر کوئی مَرَض کو مَرْض، شَرَف کو شَرْف یا عَرَق کو عَرْق کہتا ہے تو ایک گروہ کے لوگ اعتراض کرنے لگتے ہیں۔ لیکن صحیح رائے وہی ہے جو انشاؔ نے دی تھی کہ تلفظ کی صحت اور غلطی اس کے اُردو میں رواج پکڑنے پر منحصر ہے۔

اردو کا ایک عام لسانی رجحان یہ ہے کہ وہ سہ مصمّتی الفاظ میں داخلی مصوّتہ کا (یعنی زبر (َ)) کا استعمال کرتی آتی ہے۔ انشاء کے زمانے ہی میں دلی کے شرفا میں شرم، نرم اور گرم جیسے الفاظ کو شَرَم، نَرَم اور گَرَم کہنے کا چلن تھا۔ لیکن موجودہ معیاری اردو تک آتے آتے یہ رجحان نمایاں طور پر کم ہوگیا ہے۔ ___ اور جبر، قبر جیسے الفاظ اسی طرح بولے جاتے ہیں جو ان کا اصل تلفّظ ہے بلکہ یہ رجحان اس قدر قوی ہوگیا ہے کہ جو سہ حرفی الفاظ از روئے اصل متحرک الاوسط ہیں انھیں بھی ساکن الاوسط بنا دیا جاتا ہے جیسے مرض، غرض، شرف، تلف، عرق ___ مندرجہ ذیل الفاظ میں داخلی مصوّتے (VOWEL) کا استعمال عام ہے جن میں از روئے اصل جزم ہے۔ مثلاً اُردو میں کوئی اصطبل، سطر، صفر، حمل، حلف، عذر، چغد، غبن، فطر (عید الفطر) قطب، فجر، عصر، نہیں کہتا بلکہ اصطَبل، سَطَر، صِفَر وغیرہ کہتا ہے۔ یہ تلفظ ہر پڑھے لکھے کے منہ پر چڑھا ہوا ہے۔ اس طرح آج کی مہذّب گفتگو میں بھی عَمَل دَخَل، صورت شکل اور کفن دفن جیسی مرکبات میں داخلی مصوتے کا استعمال عام ہے۔ ایک لفظ اور یاد آیا۔ برہمن۔ سنسکرت میں اس کا تلفّظ وہ نہیں جو اُردو میں ہے۔

ہمیں اُردو کی تصرّفاتی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا چاہئے اور اگر ایسے الفاظ جو اس قسم کے تغیّرات کے متحمل ہو سکتے ہوں انھیں قبول کرنا چاہئے۔ اگر خالد بزمی صاحب اور اُن کے ہمنوا حضرات اس کے قائل نہیں تو نہ سہی۔ برصغیر ہند میں لاکھوں حضرات اسی طرح بولتے ہیں۔ حضرت حامد ظہور شیخوپوری نے غالباً اپنا خط فون پہ احمد صغیر صاحب کو سنایا ہوگا۔ اور دونوں نے مل کر ایک دوسرے کی تائید کی ہوگی۔ حامد ظہور صاحب کی زبان دانی کا یہ حال ہے کہ وہ 'شرفا' کے معنی تک نہیں سمجھتے اور یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا دیہاتی شرفا نہیں ہوتے۔ سبحان اللہ!

جو لوگ اس طرح سے تنقید کرتے ہیں کہ مجھے عرق اور نسل کا صحیح تلفظ نہیں معلوم اور اس وجہ سے میرے اشعار ساقط الوزن ہوتے ہیں، وہ خود زبان شناسی اور زبان کے تغیر و تبدل کے اصولوں سے ناواقف ہیں۔ اور علم عروض کی تو انھیں ہوا بھی نہیں لگی۔ اس لئے اس بحث میں پڑنا ہی فضول ہے۔ یہ یاد رہے کہ یہ بحث صرف انہی الفاظ سے متعلق ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ ہماری زبان میں اس طرح کی کھلی چھٹی نہیں ہے کہ ہر شخص اردو زبان کی لغت ہی کو بدلنے کی ٹھان لے۔

ایک غزل حاضر خدمت ہے۔ گر قبول افتد ..... الخ   اُمید ہے کہ جناب کا مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

نیک خواہشات کے ساتھ   حفظ الکبیر۔ کینیڈا

اطہر صاحب ! السلام علیکم !

نیا سال مبارک ! اللہ کرے آپ لوگ خوش و خرم ہوں۔

میرا بائی پاس آپریشن ۲۷ر ستمبر ۱۹۹۲ء کو ہوا۔ انجیوگرافی سے معلوم ہوا تھا کہ دل کی تین شریانیں بند ہیں۔ اور جب آپریشن ہوا تو پتہ چلا کہ تین کی بجائے چار شریانیں بند ہیں۔ تشخیص و مہارت کا یہ عالم کہ آج تک رو بصحت نہ ہو سکا۔ ۷ر اکتوبر کو ٹانکے نکالے گئے اور ۸ر اکتوبر کو جب ڈاکٹروں نے معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ اندر کی تمام WIRING ڈھیلی ہے۔ چنانچہ فوری طور پر مجھے آپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ اور مجھے پھر بے ہوش کر کے آپریشن کے مرحلے سے گزارا گیا۔ ۱۸ر اکتوبر کو ٹانکے نکالے گئے اور اس کے بعد میں گھر اسی حالت میں پہنچا کہ ایک گلاس پانی تک نہیں اٹھا پاتا تھا۔ سینے کے زخم ہنوز ہرے ہیں۔ ہمیشہ پندرہ بیس روز پر معائنے کے بعد سینے پر نشتر لگائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ انفیکشن بہت زیادہ ہے۔ اب تو غشی کے دورے بھی پڑنے لگے۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد بتایا کہ مانیٹرنگ کے ذریعے پتہ چلانا ہوگا کہ ایسا کیوں ہے اور یہ کہ مانیٹرنگ کے بعد بیٹری (پیس میکر) لگانی پڑے گی۔ اُدھر سینے میں بائیں طرف اتنا شدید درد ہے کہ بار بار ہسپتال میں داخل ہونا پڑا لیکن لاحاصل۔ کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ ڈاکٹر رحمٰن جنھوں نے میرا دونوں بار آپریشن کیا تھا۔ ایک روز ملے۔ ان سے معائنہ کرایا تو کہا کہ ہسپتال میں داخل کر کے پھر آپریشن کرنا ہوگا۔ اور اندر کے ٹانکے درست کرنے ہوں گے۔ تیسری بار آپریشن کا سنتے ہی میری حالت غیر ہو گئی۔ یہ ۲۷ر دسمبر کا واقعہ ہے۔ ۲۸ر دسمبر کو میں نے آغا خان یونیورسٹی ہسپتال کے چیسٹ سپیشلسٹ ڈاکٹر جاوید احمد خان کو فیس دے کر اُن سے معائنہ کرایا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ آپ ہسپتال میں داخل ہو جائیں انشاء اللہ آپریشن کی نوبت نہیں آنے پائے گی۔ آغا خان ہسپتال پاکستان کا سب سے بڑا اور بے حد مہنگا ہسپتال ہے۔ وہاں داخلے کے وقت ہی بیس ہزار روپے جمع کرنے ہوں گے۔ میرے بھائی اب تک ساٹھ ستّر ہزار روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ جن میں بیشتر میرے احباب مثلاً شاہین صاحب (کینیڈا) علی حیدر ملک، ضیا اکرام، عشاق رتر، اور افتخار اجمل شاہین صاحبان نے ادا کئے۔ مزید تعاون کے لئے میں نے صدر مملکت اور سندھ کے گورنر سے اپیل کی لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ درد کا یہ حال ہے کہ بچوں کی طرح لوٹتا اور تڑپتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ یا تو تشخیص میں کہیں کوئی سنگین غلطی ہوئی ہے یا عمل جرّاحی میں کوئی بڑا نقص رہ گیا ہے۔ بہر کیف ! اللہ جس حال میں رکھے۔ ویسے بھی مایوسی کفر ہے۔ پرچہ برابر ملتا رہا۔ اور بستر علالت پہ میرا دل بہلاتا رہا۔ اس کے لئے بے حد ممنون ہوں۔ دسمبر کا شمارہ لگتا ہے ڈاک

کی دہشت گردی کی نذر ہو گیا۔ دوبارہ بھجوا دیں تو نوازش ہوگی۔ اس خط کی اشاعت کے ذریعہ میں محترمی اکبر حمیدی۔ جناب محسن احسان
ولی عالم شاہین۔ برادر محترم اختر ہوشیارپوری، محبی عرش صدیقی، برادرم ماجد الباقری، مخلصی جعفر شیرازی، محترمی گوہر ہوشیارپوری
اور مکرمی رضا ہمدانی صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے خطوط کے ذریعے میری مزاج پرسی کی۔ اور میری صحت یابی کے لئے
نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ لیکن میں تحریری طور پر ان کو جواب نہ دے سکا کہ خط لکھتے وقت گردن نیچی کرنے سے سینے میں
درد میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے۔ "تخلیق" کے لئے بھی بڑی مشکل سے لکھ رہا ہوں۔

نیک خواہشات کے ساتھ طالب دعا شاہین بدر۔ کراچی

محترم اظہر جاوید صاحب تسلیمات!

"تخلیق" کے تازہ شمارے میں معیاری ادب کی چاشنی تو موجود ہے۔ تاہم چند معروضات پیش کرتا ہوں۔

"کسی کے واسطے جاں سے گزر گئے لوگو"

مفاعلن	فع۔ لا۔ تن	مفا۔ علن	فع۔ لُن
کسی کے وا	سطِ۔ جا۔ سے	گزر۔ گئے	لو۔ گو

نسرین گل کی اس غزل کے آخری شعر کا دوسرا مصرع

"گُل و گلستاں و برگ و ثمر گئے لوگو"

وزن سے خارج ہے کیونکہ "گل و گلستاں" رُکن مفاعلن سے تطبیق نہیں رکھتے۔

نورین طلعت عروبہ کی پہلی غزل کے آخری شعر کا پہلا مصرع ــ "ہمارے عہد میں لازم کہ تم بھی گرجا ہیں" ــ میں
نہ = نا ہو گیا ہے جو فنی سُقم ہے۔

محمد شفیع بلوچ کی نظم "اندر سے ٹوٹا ہوا آدمی" کے سارے مصرعے مفاعلن مفاعلن میں ہیں ایک مصرع "اور کچھ شکستہ
خواب کے شروع میں فاعلن آگیا ہے۔ یہ قابلِ غور ہے۔ کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

مخلص امتیاز الحق امتیاز۔ ایبٹ آباد

L No. 7830

PHONE : 230807

Monthly **Takhleeq** Lahore